23

تاریخ نویسی کا جائزہ ادب کے تناظر میں

رابطۂ ادب اسلامی (عالمی) کا سہ ماہی اردو ترجمان

# کاروانِ ادبِ اسلامی

زیرِ سرپرستی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

مرکزی دفتر رابطۂ ادب اسلامی (عالمی)

پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

# کاروانِ ادب اسلامی


**سرپرست اعلیٰ**

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (صدر رابطۂ ادب اسلامی (عالمی))

**مجلس مشاورت**

مولانا محمد ناظم ندوی
پروفیسر عبدالحلیم ندوی۔ دہلی
مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی لکھنؤ
پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی، دہلی
پروفیسر ظہور احمد اظہر
مولانا محمد سلطان ذوق ندوی
پروفیسر عبداللہ عباس ندوی، مکہ مکرمہ
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ
پروفیسر تحسین فراقی
پروفیسر وقار احمد رضوی

**مدیر مسئول**

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

**مجلس ادارت**

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی۔ جے۔ این۔ یو دہلی
پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ
مولانا نذر الحفیظ ندوی لکھنؤ

**معاون انتظامی**

اقبال احمد ندوی

**معاون طباعت**

محمد غفران ندوی



کتابت:۔ حامد
طباعت:۔ پاریکھ آفسٹ، لکھنؤ


**زرِ تعاون**

| | |
|---|---|
| فی شمارہ | چالیس روپے |
| سالانہ برائے ہندوستان | ایک سو پچاس روپے |
| پاکستان و بنگلہ دیش | تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر |
| ان کے علاوہ دیگر ممالک | چار سو روپے یا ۱۲ امریکی ڈالر |

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں ——— RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)


پتہ:۔ صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

# فہرست مضامین

جلد نمبر ۵ | اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۸ء | شمارہ نمبر ۳


۱۔ منزل بہ منزل — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۵


## مقالات


۱۔ ادب اسلامی — مولانا محمد سعید میاں مجددی — ۹

۲۔ اقبال۔ شاعر معجز بیاں — ڈاکٹر یونس حسنی — ۱۵

۳۔ نگارشات آزاد۔ معجزۂ قلم کی نمود — ڈاکٹر محسن عثمانی — ۲۴


## شعر و ادب


۱۔ نبل المراد۔ منظوم اُردو ترجمہ قصیدہ بانت سعاد — رئیس احمد نعمانی — ۴۳

۲۔ نعت — حنیف اسعدی — ۶۰

۳۔ غزل — مغیث الدّین فریدی — ۶۱

۴۔ ٹوٹے رشتے — مصطفیٰ کمال — ۶۲

گوشۂ ابوالحسن علی حسنی ندوی

# مقالات مذاکرۂ علمی

## تاریخ نویسی کا جائزہ ادب کے تناظر میں (قسط دوم)


| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت کاروان زندگی کی روشنی میں | حسین امین | ۷۰ |
| ۲۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی نثر نگاری تاریخ و تذکرہ کے تناظر میں | ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی | ۸۶ |
| ۳۔ "پرانے چراغ" کی فنی عظمت | ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی | ۹۹ |
| ۴۔ "پرانے چراغ" کا معیار و اعتبار | ڈاکٹر محمد حسین فطرت | ۱۱۵ |
| ۵۔ "پرانے چراغ" تاریخ نگاری و تذکرہ نویسی کی میزان | مولانا عبدالرحمٰن ملّی ندوی | ۱۲۲ |

محمد رابع حسنی ندوی

# منزل بہ منزل

## تاریخ اور ادب (۱)

تاریخ کا فن انسانی معاشرہ کو اس کے ترجیحی راستہ کی طرف رہنمائی کرنے میں بڑی مدد دیتا ہے، اس نے انسانی زندگی کو اس کی مطلوبہ قدروں کا پابند بنانے میں عموماً مدد کی ہے، اور اس طرح انسانی سوسائیٹیوں میں ان کے اختیار کردہ طور وطریق نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے ہیں، وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ذہنی اور شعوری لحاظ سے بڑی حد تک اپنے آباء واجداد سے جڑا ہوا ہوتا ہے، اور انسانوں کی بعد میں آنے والی نسلیں اپنے تحت الشعور میں اپنی سابقہ نسلوں کی نقل کرنے اور ان کے راستہ پر چلنے کا شوق رکھتی ہیں، اور اگر اپنے زمانہ کے حالات واثرات کے دباؤ سے ایسا نہیں کرسکتی ہیں، تو بھی اپنے اسلاف سے تعلق کا احساس ضرور رکھتی ہیں، اور ان کے طریقوں کو محبت وعظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں، بلکہ ان کو اپنے لیے مثالی نمونہ سمجھنے کا جذبہ رکھتی ہیں، قرآن میں انبیاء کا اپنی قوموں کو دینی واصلاحی دعوت دینے کے سلسلہ میں جگہ جگہ ذکر آیا ہے کہ قوموں کے افراد نے جواب دیا کہ تم ایسی باتیں کہتے ہو جو ہمارے باپ دادا میں نہیں پائی جاتی تھیں اسی طرح کے احساسات کا نتیجہ تھا کہ انسانی رجحانات اور طور وطریق کا کچھ نہ کچھ حصہ پرانی نسلوں سے نئی نسلوں کو منتقل ہوتا رہا ہے، عسکری مزاج کے اسلاف کی اولاد میں عسکری صفات اور ذہنی صلاحیتوں کی نسلوں میں ذہنی صلاحیتیں اگر پوری طرح منتقل نہیں ہوتیں تو بھی اس کے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور منتقل ہوتے ہیں، چنانچہ آرین نسلوں میں اپنا الگ مزاج ملتا ہے، سامی نسلوں میں علاحدہ خصوصیات ملتی ہیں اور اپنے آباء پر فخر کا جذبہ تو

ملتا ہی ہے۔

تاریخ کے واقعات سے انسان کے شعور اور تحت الشعور میں پیدا ہونے والے احساسات کو پیغام ملتا ہے، یہ پیغام ان کو ایک مخصوص رُخ دینے میں مدد کرتا ہے اور ان کی بنا پر بعد کی نسلوں کو اپنی سابقہ نسلوں میں برتری محسوس ہوتی ہے۔ اور ان پر فخر کرنے کا احساس ان میں پیدا ہوتا ہے اور اگر ان میں قابل فخر باتیں بالکل نہیں ہوتی ہیں تو ان کے بعد کی نسلوں کو اپنے تحت الشعور میں ایک طرح کی شرمندگی محسوس ہوتی ہے، اور یہ شرمندگی بعض وقت ان میں اپنے اسلاف کے لیے فرضی کارنامے بنا لینے تک پہنچا دیتی ہے، اور ان کے اعلیٰ کردار کے جھوٹے قصّے گڑھ لیتی ہیں۔

یہ بات یا تو اس وقت ہوتی ہے جب کسی قوم کی تاریخ میں قابل فخر کارنامے نہیں ہوتے یا اس کی تاریخ اس کے اسلاف کے کارناموں کو محفوظ نہیں کر سکی ہوتی ہے، ایسی صورت میں اپنی خواہشات کو تاریخ کی شکل دے کر قابل فخر بنا لیا جاتا ہے اور اس طرح تاریخ نویسی کو تاریخ سازی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

یہ عمل نہ صرف یہ کہ دھوکہ دہی اور فریب کا عمل ہے، جس سے صرف ایک محدود اور وقتی فائدہ تو اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن بالآخر اصحاب تحقیق و جستجو حقائق کا پتہ چلا کر حقیقت حال کا انکشاف کر دیتے ہیں، تو غلط کاری پر پانی پھر جاتا ہے۔

بہر حال تاریخ کو حقیقت نواز اور دیانت دار لوگ جب مرتب کرتے ہیں تب ہی وہ نئی نسل کو صحیح رہنمائی دے سکتی ہے۔ پھر ایسی ہی تاریخ انسانی معاشرہ کی کثیر منزلہ عمارت کی تعمیر میں مدد کرتی ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ نگاری میں دیانتداری خالص مشینی انداز کی نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ اپنا فریضہ ان الفاظ اور عبارتوں کے ذریعہ انجام دیتی ہے، جو لکھنے والے یا بیان کرنے والے کے شعور اور تحت الشعور کی غمّازی کرتے ہیں، اور اس سے واقعہ بیانی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ کا ادب سے ملاپ ہوتا ہے، لیکن اس ملاپ میں اس بات کا لحاظ ضروری

ہوتا ہے، کہ سمجھا جائے کہ اس ملاپ کے حدود کیا ہیں، یا کیا ہونا چاہئیں، اس کے حدود کم از کم ضروریہ ہوں گے کہ واقعات بیانی میں حقائق بدل نہ جائیں یا ان کی ترجمانی غلط نہ ہو، واقعہ بیانی اس طرح ہونا چاہیئے کہ حقائق نہ بدلیں اور نہ ایسی ترجمانی ہو کہ حقیقت کچھ کی کچھ نظر آئے اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ نئی نسل کو غلط لائن دینے اور اس کے خلاف واقعہ تصوّر دینے کے مرادف ہوگا۔

لیکن بہرحال تاریخ کا ادب سے رشتہ ناقابل انکار ہے، کیونکہ کوئی بھی شخص واقعہ بیانی یا واقعہ نگاری میں اپنے شعور اور تحت الشعور کی کیفیات سے مطلقاً آزاد نہیں ہوسکتا، وہ صرف مشین یا کمپیوٹر نہیں ہے، پھر تاریخ بیانی کے مقصد میں اور ادب کے مقصد میں بعض موقعوں پر اشتراک بھی ہوجاتا ہے مثلاً کسی واقعہ سے نصیحت یا عبرت حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے سپاٹ یا خشک طریقہ سے واقعات بیان کرنے سے کام نہیں چل سکتا، اس کے ساتھ کچھ ادبی پیمانوں سے بھی مدد لینا ہوگا، ہاں واقعات کو جب بجنسہٖ ذہنوں میں بطور معلومات بٹھانا ہو تو ادبی تعبیرات وطریقۂ بیان سے گریز کرنا ہوگا، بہرحال ادب کے تاریخ کے ساتھ شریک عمل ہونے کا مسئلہ خاصی نزاکت رکھتا ہے، اور بڑی احتیاط کا متقاضی ہے، دراصل اس میں موقع ومحل اور مقصد عمل وصدق گوئی تینوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

تاریخ کے ادب کے ساتھ ربط ہونے ہی کے اثر سے صنف شعر میں مثنوی، شاہنامے وجود میں آئے اور صنف نظم میں ادب نے تاریخ کا دامن پکڑا یا تاریخ نے ادب سے مدد لی، نثر کے میدان میں بھی تاریخ وادب جگہ جگہ ایک دوسرے سے قریب آتے ہیں، اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اور جگہ جگہ ایک دوسرے سے دور بھی ہوجاتے ہیں، مشہور شخصیات کی تاریخ، مشہور مقامات کی تاریخ اور اس طرح متعدد دوسری اصناف تاریخ میں ادب کی محتاط شرکت یا معاونت صاف دیکھی جاسکتی ہے۔

دراصل باشعور اور صاحب احساس انسان کا کوئی کام اس کے ذاتی اور نفسیاتی

تأثر کے سایہ سے باہر نہیں رہ پاتا اب یہ الگ بات ہے کہ اس کا تناسب اور صحیح مقدار کیا ہونا چاہیئے اور کون سی مقدار تاریخ کے منصفانہ رویہ کو مجروح نہیں کرتی، اور کون سی مقدار تاریخ کو اس کا اپنا فرض ادا کرنے سے مانع بن جاتی ہے، اس کو صاحب قلم تاریخ وادب دونوں کے مقاصد وخصوصیات سے سمجھتا اور انجام دے سکتا ہے۔

رابطۂ ادب اسلامی نے جو ادب کے کام وپیغام کی ایک با مقصد انجمن ہے، ادب اور تاریخ کے نازک ربط کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اپنے سالانہ مذاکرۂ علمی کا ایک اجتماع اسی موضوع پر منعقد کیا، یہ مذاکرۂ علمی پونا شہر میں ۶، ۷ رجون ۱۹۹۸ء کو منعقد ہوا، اس میں یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے نمائندوں کی ایک وقیع تعداد نے شرکت کی اور فکر انگیز مقالے پڑھے ان مقالات کا ایک انتخاب کاروانِ ادب کے اس شمارے میں پیش کیا جارہا ہے جن سے اس موضوع کے سلسلہ میں متعدد مؤثر اہل علم وادب کی آراء کا نمونہ سامنے آئے گا۔[1]

## مجلّہ کی قیمت اور تعداد صفحات

چار سال قبل شروع کیا گیا ہمارا کاروان ادب کا یہ سہ ماہی مجلہ ۲۰۸ صفحات کا رکھا گیا تھا، اور اس کا سالانہ چندہ ڈیڑھ سو روپئے طے ہوا تھا۔ لیکن گرانی کی مسلسل رفتار نے مجلّہ کے اخراجات بڑھا دیئے ہیں جس کی وجہ سے اس کے چندہ میں ایک نہائی اضافہ کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے، جس پر عمل کرنا ضروری معلوم ہوا، لیکن یہ مناسب سمجھا گیا کہ چندہ میں اضافہ کے بجائے مجلّہ کے صفحات میں ۱/۴ کی کمی کردی جائے۔ تاکہ خریداروں پر مالی بار کا اضافہ محسوس نہ ہو۔ لہٰذا اس شمارہ سے اس پر عمل کیا جارہا ہے۔ اور مجلّہ کے صفحات میں ۷۰ صفحات کی کمی کی جارہی ہے۔ لیکن یہ اس طریقہ سے کیا جارہا ہے کہ مجلّہ کے مواد وتنوع میں اس کا اثر محسوس نہیں کیا جائے گا

---

[1] ان مضامین میں مختلف شخصیات اور ان کی کتابوں پر مضامین شامل ہیں، ان میں سے جو مضامین صدر رابطہ حضرت مولانا مدظلہ العالی کی شخصیت اور ان کی کتابوں کے ساتھ مخصوص تھے انھیں اس شمارہ میں دیا جارہا ہے، دیگر شخصیات سے متعلق مضامین اگلے شمارہ میں آئیں گے۔

مولانا محمد سعید مجدّدی

# ادبِ اسلامی

انسان کی زبان اور قلم سے نکلنے والے صحیح بامعنی بہترین اور نادر کلام کو جو بہ شکل نثر ہو یا بہ شکل نظم ادب کہا جاتا ہے۔ ادب کا سرچشمہ انسانی تخیل ہوتا ہے اور اس کی وسعت انفس آفاق میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں تمام محسوسات معقولات، مشاہدات، مسموعات، تخیلات وجذبات اور خواہشات وضروریات کی ترجمانی ہوتی ہے یہ ترجمانی جس قدر بہتر خوبصورت اور نفیس ہوتی ہے اسی قدر وہ دلکش اور با اثر ہوتی ہے۔

جب سے انسان نے اس عالم رنگ وبو میں قدم رکھا ہے اسی وقت سے آغاز کلام ہوگیا ہے کلام ہی زمینِ ادب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ابتداء میں کلام انسانی میں وہ خوبی نہ آئی ہو جس سے اس کو ادبی مقام حاصل ہوتا ہے، تاہم چونکہ صفت گویائی انسان کی امتیازی صفت ہے اس لیے نطق وگویائی کے آغاز سے ہی ادب کا آغاز سمجھا جا سکتا ہے۔

اولاً تو خالق انسان نے ہی انسان کو ناطق اور صاحب بیان بنایا خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (الرحمٰن ۔۳۔۴) اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان سکھایا۔ بیان کے معنی ہیں بذریعہ الفاظ اظہار مافی الضمیر۔ پھر آسمانی صحیفوں سے انسانی کلام وبیان کو جلا بخشی گئی اور اس کی صحیح رہنمائی کی گئی ... انسان اوّل اور نبیِ اوّل حضرت آدم علیہ السّلام پر دس صحیفے نازل کیے گئے پھر ان کے صاحبزادہ حضرت شیث علیہ السّلام پر تیس صحیفے اتارے گئے یہ سب سریانی زبان میں تھے (عمدۃ القاری) اور ان کا مقام تاریخ ادب انسانی میں اولین ادبی سند اور اولین ادبی دستاویز کا مقام ہے۔

پھر انسانی معاشرہ نے ارتقائی منزلیں طے کیں تو ادب انسانی کا بھی ارتقاء ہوا اور معاشرہ کی اچھائیوں اور برائیوں کا عکس ادب میں ظاہر ہوتا رہا خالق عالم کی طرف سے معاشرہ کی اصلاح کے لیے انبیاء علیہم السّلام کو وقتاً فوقتاً بھیجا جاتا رہا اور ان کی تعلیمات اور آسمانی صحیفوں اور کتابوں کے انزال سے انسانی زندگی کے تمام شعبوں کی اصلاح کی جاتی رہی۔ اس اصلاح کا ادب پر بھی گہرا اثر پڑا۔ یعنی صالح اور غیر صالح مفید اور مضر ادب کی رہنمائی ملتی رہی تا آنکہ نبیِّ آخر الزماں حضرت محمد صلّے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بعثت اور تنزیل قرآن مجید پر ہدایت ربانی کا یہ سلسلہ مکمل کیا گیا۔ اس کے بعد ادب صالح جس کا دوسرا نام ادب اسلامی ہے نمایاں طور پر وجود میں آیا جس کے مصادر و مآخذ قرآن مجید اور احادیث رسول قرار پائے۔ یہی ادب اسلامی کا آغاز ہے یہ اگرچہ اولاً عربی زبان میں ظاہر ہوا لیکن جلد ہی اشاعت اسلام اور فتوحات اسلامیہ کی بدولت ہر زبان میں اور ہر قوم کے ادب میں اس کا اثر ظاہر ہوا۔

قرآن مجید بہترین فصاحت و بلاغت میں نازل ہوا اس کی فصاحت اور بلندیِ کلام کا تمام ادبا، خطباء اور شعرائے زمانہ نے اعتراف کیا اس کے الفاظ کی ندرت معانی کی وسعت مضمون کی حکمت اور کلام کی بلاغت کا دلوں پر اثر ہوا اور کوئی بھی بڑے سے بڑا ادیب خطیب اور شاعر ایک آیت کے بقدر بھی اس جیسا کلام پیش کرنے پر قادر نہ ہو سکا جیسا کہ خود قرآن مجید نے اپنے متعلّق بیان کر دیا کہ:

قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیراً (الاسراء ۸۸)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر سب انسان اور جن اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن کے مثل بنا لائیں تو اس کے مثل نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔

قرآن مجید کے بعد کلام رسول بھی ادب اسلامی کا مصدر اور مآخذ ہوا۔ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال آپ کے خطبے، آپ کے ارشادات، آپ کی دعائیں اور آپ کے خطوط و مکاتیب کو ادب عربی میں نہایت ممتاز مقام حاصل ہوا۔ آپ کے نادر جامع اور

فصیح و بلیغ کلمات ادب عربی کے لیے سرمایۂ افتخار ہوئے جن پر وحی الٰہی کا پرتو ہوتا تھا اور جو علم و حکمت سے لبریز ہوتے تھے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ادب کا سرچشمہ انسانی تخیل ہوتا ہے، علم اس کو روشن کرتا ہے اور کلام اس کو ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید نے سب سے پہلے انسانی تخیل اور انسانی فکر و شعور کو ہی درست کیا۔ انسان، کائنات اور خالق کائنات کے بارے میں علم صحیح عطا کیا اور دیگر مخلوقات میں انسان کے مقام کو اور اس کی برتری کو واضح کیا کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (الاسراء۔۷۰)

بیشک ہم نے اولاد آدم کو عزت دی اور ان کو خشکی اور تری میں سوار کرایا اور پاکیزہ چیزوں سے ان کو رزق دیا اور ہماری پیدا کی ہوئی بہت سی مخلوق پر ان کو فضیلت دی۔

اسلامی ادب اسی فضیلت کے شعور پر قائم ہوتا ہے۔ عام ادب میں اس کا خط امتیاز یہی ہے کہ جب خالق انسان نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی ہر چیز اشرف ہی ہو۔ یعنی تخیل فکر و شعور قول و عمل اخلاق و معاملہ نظام معاشرت سب ہی اشرف ہوں۔ اس کی زندگی حیوانی زندگی کی طرح بے تہذیب بے اصول بے حیاء بے غیرت بے مروّت اور بے قید نہ ہو کہ وہ اپنی زندگی کے تقاضے جس طرح چاہے پورے کرے جس میں نہ کسی اصول کی پابندی ہو اور نہ کسی چیز کا لحاظ ہو.... ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کو ایک اعلیٰ و ارفع ضابطۂ حیات دیا گیا ہے جس کے تحت اس کی زندگی کے تمام شعبے اور تقاضے ہیں اس ضابطۂ حیات کے مطابق اگر وہ زندگی گزارتا ہے تو وہ انسانی شرافت و کرامت سے آراستہ رہتا ہے ورنہ نہیں رہتا۔ اسلامی ادب ہر میدان میں اسی شعور کو لیے ہوئے اُبھرتا ہے۔ اس کی تنوع کے اعتبار سے حد بندی نہیں ہوتی ہے بلکہ انسانی شرافت و کرامت کے اعتبار سے حد بندی ہوتی ہے۔ جو صدق و عفاف حیا و ایمان تہذیب و ادب اور مروت و اخلاق پر قائم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلامی

ادب کا خط امتیاز اس کو زندگی کے میدانوں سے الگ نہیں کرتا اور انسانی تخیل کی پرواز کو محدود نہیں کرتا اور اس کی ذہنی و فکری وسعتوں کو تنگ نہیں کرتا بلکہ ان وسعتوں میں وہ انسانی اشرفیت اور اس کے مقام کی برتری کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ خلاف اشرفیت مواد کو رد کرتا ہے اور اشرفیت سے آراستہ یا اس کے موافق ہر وسیع سے وسیع مواد کو اندر شامل کرتا اور سموتا ہے۔

بعلم و عقل انساں کو بنایا خلق میں اشرف
کہ اشرف ہو عمل میں بھی بفطرت بھی ہے اشرف

کیا ممتاز پھر اس کو بصورت بھی بسیرت بھی
کہ تکمیل فضیلت ہو بہیئت بھی بخصلت بھی

پیامِ حسن اعمالی پیامِ زندگانی ہے
یہ فرمانِ الٰہی ہے متاعِ کامرانی ہے

کیونکہ انسانی زندگی کلام و بیان سے فطری طور پر وابستہ ہے اور سننا اور بولنا انسان کا ایک طبعی تقاضا ہے اور کلام و بیان بہرحال اس پر اثر انداز ہوتا ہے اس لیے انسانی زندگی کی تعمیر و تخریب میں ادب کا نمایاں رول ہے۔

مسرّت ہے کہ اسلامی ادبا میں بڑی حد تک یہ شعور بیدار ہے اور عربی فارسی اور اردو ادب میں اس کا اثر موجود ہے۔ تاہم آزادی فکر و عمل کے غلط رجحان نے اور بے دینی کی عمومی فضا نے اس شعور کو مضمحل کیا ہے اور بے راہ روی، بے حیائی، عریانی، بے ادبی، بے مروتی بے تہذیبی جھوٹ مکر و فریب اور حرص و ہوس اور فطری قوانین و روابط و تعلقات سے سرکشی کو ترقی اور آزادی سمجھا گیا ہے جو کہ آزادی نہیں ہے بلکہ سراسر نفس و خواہشات کی غلامی اور قوانین قدرت کی خلاف ورزی اور انعامات الٰہی سے محرومی ہے اور انسانیت کے لیے باعث تڑپ و اذیت اور باعث تباہی و بربادی ہے اس لیے اسلامی ادبا پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس انسانی بگاڑ کے سدھار کے لیے اپنا کردار ادا کریں یعنی ادبی تخلیقات و تصنیفات میں تعمیری اور اصلاحی کردار نمایاں کریں خواہ وہ جمالیاتی ادب ہو یا تفریحی، بصورت نثر ہو یا بجامہ نظم،

بہر حال ہر صنف ادب میں تعمیری رنگ ہو اور اخلاقی خوبیوں کا مظہر ہو۔ کیونکہ اصل چیز بقائے انسانیت ہے انسانی صفات کے معدوم ہونے پر نہ کسی چیز کی کوئی قیمت ہے اور نہ کسی ادب کی کوئی حیثیت۔

اس سلسلہ میں قدیم و جدید اسلامی ادبا کے ان ذخیروں کو بھی اجاگر کرنے کی ضرورت ہے جن میں یہ محاسن موجود ہیں اور جو بہترین ادبی شاہکاروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی و تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبّت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبّت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی

زمانہ گواہی دے رہا ہے کہ قوانین قدرت سے سرتابی میں انسانیت تڑپ رہی ہے اور

یہ کہ ایمانی اصول زندگی وآداب ہی بہترین انسانی اصول وآداب ہیں جن میں حقوق انسانی کی ادائیگی بھی ہے احترام انسانیت بھی ہے طبعی میلانات کی تکمیل بھی ہے فطری روابط وتعلّقات کی اہمیت بھی ہے انسانی شرافت وکرامت کا لحاظ بھی ہے اور بشری کمزوریوں کا لحاظ بھی ہے۔

ڈاکٹر یونس حسنی

# اقبال ـــــ شاعرِ معجز بیاں

اقبال ہماری اس قدیم روایت کی کڑی تھے جس میں لوگ یک فنے نہیں ہوتے تھے۔ ان کی عملی اور فکری ترک تازیوں کا دائرہ، دائرہ در دائرہ ہوتا تھا۔ اقبال معلّم تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے استاد تھے، وہ قانون داں تھے، بیرسٹر تھے اور لاہور میں وکالت کرتے تھے، وہ سیاست داں تھے اور تصوّرِ پاکستان کے معمار تھے، وہ گول میز کانفرنس میں مسلمانانِ برصغیر کی نمائندگی کرتے تھے، وہ فلسفی تھے اور ایران میں مابعد الطبیعیات کے ارتقاء کے موضوع پر جرمنی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کر چکے تھے۔ ان کی ان متعدد اور کسی حد تک متضاد حیثیتوں میں سے ایک حیثیت شاعر کی تھی اور اسی حیثیت نے انھیں شاعرِ مشرق کے مقام بلند تک پہنچایا۔ اسی حیثیت نے انھیں بین الاقوامی شہرت دی اور یہی حیثیت مسلمانانِ عالم کے دل کی دھڑکن بن کر ان کے سینوں میں تلاطم بپا رکھتی ہے۔

اقبال بحیثیت استاد کسی غیر معمولی حیثیت کے آدمی نہیں۔ وکالت میں وہ زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ عام بیرسٹروں کی طرح اس میں کسی قابل ذکر کارنامے کے بغیر اپنے پیشہ ورانہ تقاضے پورے کرتے رہے۔ سیاست داں اور عملی سیاست داں کے طور پر بھی ان کا مقام زیادہ بلند نہیں۔ پاکستان کے قیام میں ان کے تصوّرات اور ان کی عملی جدوجہد انھیں برصغیر کا ایک اہم سیاسی رہنما تسلیم کرانے کے لیے اپنا محسن اور نجات دہندہ بنا سکتی تھی اور بنایا۔ فلسفی کی حیثیت سے وہ دنیا کے فلسفے میں کسی بلند مقام کے حامل نہ ہو سکے لیکن جس چیز نے انھیں

بین الاقوامی شہرت اور آفاق گیر عظمت عطا کی، وہ ان کی شاعری ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کی شاعری کو آفاقیت عطا کرنے میں ان کی فلسفہ دانی اور سیاست سے ان کی علمی اور عملی وابستگی نے اہم کردار ادا کیا مگر خود ان کا فلسفہ اور ان کی سیاست زندہ اور پائندہ رہنے کے لیے ان کی شاعری کے محتاج رہے۔ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں جو فلسفیانہ تصورات پیش کیے وہ اگر نثر میں پیش کیے جاتے تو کیا وہ اقبال کو ایسی ہی اور اتنی شناخت دلا سکتے تھے اور وہ تصوّرات اسی وزن و وقار کا باعث ہوتے جو آج انھیں حاصل ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال آج عظمت کے جس مقامِ بلند پر فائز ہیں وہ اپنی شاعری کے طفیل ہیں تو سوچنا پڑتا ہے، آخر کیوں؟ شاعر تو سیکڑوں ہو گزرے ہیں اور اعلا سے اعلا تر، عظیم سے عظیم تر، پھر اقبال کی شاعری میں کیا بات ہے جو انھیں اس مقامِ بلند تک لے جانے کا باعث بنی۔

ہم مروجہ طور پر جب شعر کا مطالعہ کریں تو نصابی انداز میں اگر معشوقِ دنیوی سے مخاطبت ہو تو شعر کو عشق مجازی پر مبنی کہتے ہیں اور اگر خطاب خدائے برتر و بزرگ سے ہو تو شعر کو عشقِ حقیقی کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ ان معنوں میں اقبال کی شاعری کی بنیاد نہ تو عشق حقیقی پر ہے نہ ہی عشق مجازی پر، وہ تو تصوّف کے اس معروف تصوّر ہی کے صریحاً مخالف تھے جس کے زیر اثر "عشق حقیقی" پر مبنی اشعار وجود میں آتے ہیں تاہم پھر بھی ان کی شاعری "عشق" کی آفریدہ ہے۔ "عشق" ان کے ہاں ایک وسیع تناظر رکھتا ہے۔ وہی تناظر جس میں میر کے والد نے ان سے کہا تھا "میاں، عشق کرو عشق! کہ عشق جلاتا ہے اور عشق جلاتا ہے"۔

اقبال کی شاعری کی قوّتِ محرکہ ایسا ہی عشق ہے۔ انھیں عشق ہے اُمّت مسلمہ سے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ کسی کو اُمّت مسلمہ سے عشق ہو اور وہ خدا سے محبّت نہ رکھتا ہو؟ اس لیے ان کے عشق کا ایک اور ہدف ذات خداوندی ہے۔ پھر جو خدا سے عشق کرتا ہو وہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے عشق سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اب اقبال کے عشق کے اہداف خدا، اس کا رسول صلّے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور اس رسول صلّے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی برپا کردہ اُمّت مسلمہ ہے۔ یہ عشق

محض دعویٰ نہیں۔ اگر دعویٰ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ یہ عشق تو وہ ہے کہ:

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو

اور جب تک سوزِ عشق میں مل کر کوئی خاک نہ بن جائے۔ کندن نہیں بن پاتا۔ اقبال عشق کے ان مراحل سے عملاً گزرتے تھے ان کی زندگی عام شعرا کی طرح قول و فعل کے تضاد کا شکار نہیں وہ عشق کی ہر لذّت سے آشنا اور اس کی ہر ہر ادا کے مارے ہوئے تھے اور جب وہ کہتے ہیں کہ:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

---

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

تو عشق کے وہ تمام اسرار ان پر کھل چکے ہیں جن کے زور پر دنیا میں عظیم کارنامے انجام دیئے گئے۔ آج تک فرزانوں نے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ کارنامے تو فقط دیوانوں کے نامۂ اعمال کی زینت ہوا کرتے ہیں۔ اقبال اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں۔ مسجد قرطبہ کی عظمت و شوکت کو دیکھ کر پکار اٹھتے ہیں۔

اے حرمِ قرطبہ، عشق سے تیرا وجود!
عشق سراپا دوام جس میں نہیں ہست و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اور اقبال کا معجزۂ فن بھی خونِ جگر سے نمو پاتا ہے۔ اس لیے اس میں بھی وہی عظمت و دوام ہے جو عشق کا حاصل ہوتا ہے۔ اسی نظم میں ایک اور جگہ کہتے ہیں:

عشق دمِ جبرئیلؑ عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

عشق پر اس غیر معمولی زور اور عقل سے اجتناب کے رویے سے دھوکا کھا کر بعض ناقدین نے اقبال پر اعتراض کیا ہے کہ وہ عقل بیزار اور جذبہ و جنوں کے شکار تھے۔ اس قسم کی آراء عشق کے اس عظیم تصور سے ناآشنائی کے سبب ہیں جو اقبال کے ذہن و فکر میں سمایا ہوا تھا بھلا ایک مفکر، جس نے قوم و ملت کی قیادت کا بار اٹھایا ہوا ہو، جس نے فلسفے میں سندِ فضیلت حاصل کی ہو اور جو فکر کے بغیر نوالہ نہ توڑ سکتا ہو، خرد سے کیوں کر بے نیاز رہ سکتا ہے ایک غزل میں اقبال نے کہا تھا۔

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی، حیرت کی فراوانی

دراصل وہ جس عقل کو یہ کہہ کر مسترد کر رہے ہیں کہ:

عشق تمام مصطفےٰؐ، عقل تمام بولہب

وہ بولہبی عقل ہی تو ہے۔ وہ عقل جو ہر اچھے، نیک اور عظیم کام میں مزاحم ہوتی ہے۔ چوں و چرا سکھاتی ہے اور ہر عظیم کارنامے سے فرار، ہر قربانی سے گریز اور نفس کی ہر تکلیف سے اجتناب کے دلائل سمجھاتی ہے۔ خیال فرمائیے کہ ایک شخص کے انتہائی بڑھاپے میں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ اس لڑکے اور اس کی ماں کو ایک بے آب و گیاہ لق و دق وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ اور وہ چھوڑ آتا ہے۔ جب لڑکا بڑا ہوتا ہے تو اشارہ ملتا ہے کہ اسے راہ حق میں قربان کر دو۔ اب دانشِ برہانی کے تقاضے سے دیکھئے تو سوچتے کہ ہو سکتا ہے، میرا یہ خواب محض ایک بُرا خواب ہو۔ خدا نے انسانی جان کی حرمت رکھی ہے، وہ انسانی جان کا اتلاف کیونکر آنے لگا۔ یہ اور اس قسم کے کتنے ہی دلائل دانشِ برہانی پیش کر سکتی ہے مگر دانشِ نورانی قربانی پیش کرتی ہے۔ باپ ذبح کرنے پر اور بیٹا قربان ہونے پر تل جاتا ہے۔ اور پھر اللہ کی طرف سے ان باپ اور بیٹے پر نوازشیں ہوتی ہیں۔ حرم محترم

اور اس میں ادا کیے جانے والے مراسم عبودیت اس پر گواہ ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا عمل عشق کا آفریدہ ہے، دانش نورانی کا زائیدہ ہے اور دانش برہانی شیطانی وساس کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال اسی عشق، یا دوسرے الفاظ میں دانش نورانی کے مارے ہوئے تھے۔ جس آتش عشق نے انھیں جلا کر خاکستر کیا تھا، اسے وہ ملّت کے ہر فرد کا مقدر بنا دینا چاہتے تھے کہ ان کے نزدیک قربِ خداوندی اور استحقاق توجہ خاص کا سبب یہی اور صرف یہی عشق ہو سکتا ہے۔ ساقی نامے میں کس زور و شدّت سے کہا ہے۔

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
امنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری، جستجوئیں مری
مرا دل، مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

اُمّتِ مسلمہ کی بیداری اور بیدار بختی کے لیے جو نسخہ انھوں نے تجویز کیا ہے، یعنی خودی کا فلسفیانہ تصوّر، جو ان کے فلسفہ کی مرکزی اساس ہے، یہ بھی عشق ہی کا حاصل ہے کائنات میں اپنی مرکزیت کا احساس اور خدا کا آخری پیغام ہونے کا امتیاز ہی وہ اوصاف ہیں جو اُمّتِ مسلمہ کو حیاتِ نو بخش سکتے تھے۔ مگر یہ نسخۂ شفا، یعنی خودی، اگر بے لگام ہو تو شیطانی صفت ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ خودی کے منہ زور گھوڑے کو اطاعت نفس کی لگام دیتے ہیں اور بے خودی کے تصوّر کے ذریعہ انفرادی خودی کو اجتماعی خودی میں ضم

کر دینے کی تلقین کرتے ہیں اور یہیں ان کے شاعرانہ تصوّرات اس تنظیم و ترتیب سے آراستہ ہوتے ہیں جو فلسفے کی ودیعت ہیں۔ اس پورے نظامِ فکر کو اقبال نے اس غیر معمولی شاعرانہ فطانت اور وقارِ الکلامی سے ادا کیا ہے کہ شاعری پیغمبری سے لگا کھانے لگتی ہے۔ اعجاز شاعرانہ کی یہ غیر معمولی قوّت ہی تھی جس نے اقبال کے فلسفے کو ایک ایسی شعری جاذبیت عطا کی جس کے جادو سے مفر ممکن نہیں اور ان کی شاعری سحر و جلال کی کرشمہ سازی بن گئی۔

اپنے فلسفیانہ تصوّرات کی روشنی میں وہ سمجھتے تھے کہ اگر اُمّتِ مسلمہ شجاعت، صداقت اور عدالت کے فراموش کردہ سبق کو دہرائے تو آنے والا عہد امت کی سیادت اور قیادت کا عہد ہوگا، "طلوعِ اسلام" میں جس ایقان کے ساتھ انھوں نے امّت کے روشن مستقبل کی بشارت دی ہے وہ ان کے لیے محض پیش گوئی نہ تھی بلکہ یہ ان کے ایمان و ایقان کا حصّہ تھا۔ کہتے ہیں۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی

اس نظم کے آخری بند تک پہنچتے پہنچتے ان کا خواب حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے اور وہ چشمِ بیدار سے اپنی بشارت کو وجود پا کے خود دیکھ لیتے ہیں۔ دیکھئے کس قدر لہک کر بڑی سرشاری سے کہتے ہیں۔

بیا ساقی نوائے مرغ زار از کوہسار آمد
بہار آمد، نگار آمد، نگار آمد، قرار آمد
کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد

کنار از زاہداں برگیر و بے باکانہ ساغر کش
پس از مدّت ازیں شاخِ کہن بانگ ہزار آمد

اقبال نے جس عہدِ فرخ فال کی بشارت دی تھی، ان کی نگاہِ تصوّر نے اسے دیکھ لیا تھا مگر وہ عہدِ سعید بریا نہ ہو سکا، اسی لیے بعض حضرات نے اقبال کے ان خیالات کو شاعرانہ خوش فہمی قرار دیا ہے۔ مگر اقبال نے اُمّتِ مرحومہ کے عروج کے لیے اور اس کی نشأۃ ثانیہ کے لیے جو شرائط عائد کی تھیں، یعنی جتنے "اگر" اور "مگر" لگائے تھے ان کی تکمیل عالمِ اسلام کے کسی لیڈر سے نہ ہو سکی اور اُمّت ہنوز اس مردِ حق کے انتظار میں ہے جس کے لیے اقبال نے کہا تھا:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

اگر ہم رختِ سفر ہی فراہم نہ کر سکے تو اس میں نہ منزل کا قصور ہے، نہ کارواں کا۔ یہ تو میرِ کارواں کی نااہلی، تہی دامانی اور بدنصیبی کی داستان ہے

یہاں میں ایک سخن گسترانہ بات کہنا چاہتا ہوں۔ انیسویں اور بیسویں صدیوں میں خود برصغیر میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لیے کئی تحریکیں اٹھیں، سیّد احمد شہید کی تحریک مجاہدین ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تحریک، سرسیّد کی تحریک اصلاح، تحریک ریشمی رومال، تحریک ہجرت، تحریک خلافت، خاکسار تحریک اور آخر میں مولانا مودودی کی تحریک نفاذ اسلام۔ ان تحریکوں نے ہماری قومی اور ملّی زندگی پر اَن مٹ نقوش ثبت کیے ہیں اور کاروانِ ملّت کو اس کی منزل کی طرف گامزن کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں مگر یہ ساری تحریکیں اپنے رہ نما کی بصیرت کے علاوہ سیکڑوں کارکنوں کی بے مثال قربانیوں، جان و مال کے ضیاع اور زندگیوں کے وقف الی اللہ کے سبب وہ نتائج مرتب کر سکیں جو آج ہم محسوس کرتے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھئے تو اقبال وہ تنہا مفکّر ہے جس نے کسی جماعت، کسی کارکن اور کسی مادّی وسیلے کے بغیر محض اپنی شعری گراں مائیگی کے زور پر ملّت اسلامیانِ برصغیر کو جس طرح اور جتنا متأثر کیا، اتنا کوئی تحریک متأثر نہیں کر سکی۔ آج مسلمانانِ برصغیر کا ایوانِ فکر

اقبال کے تصوّرات سے آراستہ ہے۔ ہم اقبال کی نظر سے دیکھتے، ان کے ذہن سے سوچتے اور ان کی زبان میں بولتے ہیں اور یہ حیثیت، میرے خیال میں شاہ ولی اللہ کے بعد کسی اور کے حصّے میں نہ آسکی۔ اقبال کی شاعری عوامی دل چسپی کی چیز نہیں۔ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ فکر اقبال کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتے، عام پڑھے لکھے اس کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے، مگر ہمارے طالب علم ہوں یا دینی علماء، سیاسی لیڈر ہوں یا فٹ پاتھ پر دوائیں بیچنے اور مجمع لگانے والے روایتی سیلز مین، سب اقبال کے اشعار سے اپنی مافی الضمیر ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قوّالی کی محفلیں ہوں یا سیاسی اسٹیج، دینی مدارس ہوں یا محراب مسجد، ہر جگہ اقبال کے الفاظ کی حکم رانی ہے، اس کا شعر بولتا ہے اور خون کو گرماتا ہی نہیں، خود ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتا بھی ہے۔

میں ہفت زباں تو کیا، پنج زباں بھی نہیں لیکن جو زبانیں میں جانتا ہوں، اور جن سے میں تراجم کے ذریعہ آشنا ہوں، ان میں میں کوئی ایسا فن کار نہیں پاتا جو اپنی قوم کی انفرادی اور معاشرتی زندگی پر اتنی مضبوط گرفت رکھتا ہو اور اس کے مقدر کو بدلنے کی ایسی طاقت کا حامل ہو جیسا کہ اقبال ہیں۔

اقبال کی عظمت کو ایک اور طریقے سے بھی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے، تاروں بھرا آسمان لہلہاتے کھیت، کھلتی ہوئی کلیاں، مہکتے ہوئے باغ، معصوم بچّے، گرمی کی دوپہر میں سایہ دیوار و درخت، کوری صراحی کا ٹھنڈا پانی، خوبصورت چہرے اور خوش ادا دوشیزائیں بجائے خود اپنے اندر وہ حسن و جمال رکھتے ہیں کہ ایک اچھّی شاعرانہ فطرت کا شاعر ان کا سہارا لے کر اپنا جادو جگا سکتا ہے۔ یہ شاعرانہ موضوعات ہیں جو شعر کے پیکر میں ڈھل کر دو آتشہ ہو جاتے ہیں اور اپنے خالق کے لیے داد و تحسین ہی نہیں ادبی دوام کا سبب بھی بنتے ہیں مگر اپنی قوم کی غلامی سے نجات اس کی خودی کی بیداری، نئی دنیا کی تعمیر اور قیادت و سیادت کے مقام بلند کے لیے تیاری عمرانیات و سیاسیات کے موضوع ہوں تو ہوں، شاعرانہ موضوعات نہیں۔ اقبال نے ان غیر شاعرانہ، بے نمک اور غیر دلچسپ موضوعات کو اپنے شاعرانہ اعجاز کے ذریعے وہ حسن

ورعنائی عطا کی ہے جو نہ بہتے دریاؤں میں نظر آتی ہے، نہ کھلتی کلیوں میں، نہ لہراتے رنگوں میں، نہ ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں، نہ حسن خوابیدہ میں اور نہ جمال ہوش ربا میں۔ یہ ایک ایسا محیر العقول کارنامہ ہے جس نے اقبال کے شاعرانہ تخیل کو اعجازِ عیسوی عطا کیا ہے۔ انھوں نے قوم کے تن مردہ ہی میں جان نہیں ڈالی ہے بلکہ بے جان موضوعات کو اپنی قوت عشق سے حسن جہاں سوز عطا کر دیا ہے۔

اقبال شاعری کے اعجاز سے ابتدا ہی سے واقف تھے۔ جب انھوں نے شعر گوئی شروع کی تو استادی کے لیے ہندوستان بھر میں انھیں صرف داغ نظر آئے۔ حالاں کہ داغ کے مذاق شعری اور مزاجِ ذاتی سے اقبال کا کوئی علاقہ نہ تھا تاہم وہ جانتے تھے کہ لفظ کو زندگی عطا کرنے کے لیے زبان پر قدرت ضروری ہے اور یہی انھوں نے داغ سے سیکھا۔ شاعری الفاظ کا اعجاز ہی تو ہے۔ اقبال نے لفظیات کی وہ دنیا تخلیق کی جو چاہے داغ کی تربیت کا نتیجہ ہو مگر داغ کی دین نہیں۔ اردو کے سیکڑوں الفاظ ہیں، تشبیہات و تلمیحات ہیں جو اقبال کے یہاں نئی معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسی معنویت جو صرف ان تک مخصوص ہے اور لطف یہ ہے کہ اس جدید معنویت کو سمجھنے میں قاری کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ جس شخص کو اقبال کے فکری نظام کی شدبد ہے وہ ان کی اس معنویت تک بہ آسانی رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

ایک زمانے میں بظاہر یورپ کی مادّی و سائنسی ترقی سے متاثر ہو کر اقبال نے بھی شعر کو کارِ بے کار اں خیال کیا تھا اور یہ کہہ کر کہ:

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انھیں مذاق سخن نہیں ہے

شاعری ترک کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر بھلا ہو پروفیسر آرنلڈ کا کہ انھوں نے حکماً اقبال کو اس سے روک دیا۔ تصوّر کیجیے کہ اگر اقبال اس وقت شاعری ترک کر دیتے تو امت مسلمہ کس قدر بڑے نقصان سے دوچار ہو جاتی۔ کیا اس نقصان کی تلافی کسی طور ممکن ہوتی؟

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

# نگارشات آزاد

## معجزۂ قلم کی نمود

مولانا آزاد ایک عبقری انسان ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے اور ایک ایسے فاضل یگانہ تھے جس نے خود ان کے بقول رب المشرقین والمغربین کے مدرسہ سے سند حاصل کی ہو، انھوں نے عام دنیوی دانش گاہوں سے فیض حاصل نہیں کیا، ان کی حیرت افروز شخصیت کی طرح ان کا اسلوب بھی معجز نما تھا۔ اگر تاج محل کے حسن اور لال قلعہ کے شکوہ اور قطب مینار کی بلندی کو کسی نثری اسلوب کے پیکر میں ڈھالنا ممکن ہوتا تو اس سے وہ نثر وجود میں آتی جسے ابوالکلام کی نثر کہتے ہیں اور جسے دیکھ کر حسرت موہانی نے کہا تھا کہ ؎

جب سے دیکھی ہے بوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

انگریزی کے ایک معتبر ناقد کا قول ہے کہ اسلوب کا حسن ایک تندرست اور خوبصورت جسم کے مانند ہوتا ہے جس کے ایک لفظ کو بھی ادھر سے ادھر کردوگے تو خون بہنے لگے گا مولانا کے اسلوب میں بھی ہر لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے، ہر عبارت مستحکم اور مربوط لالہ وگل کے تختہ کے مانند ہے جس سے آرائش چمن ہوتی ہے، ہر سطر دامانِ باغبان اور کف گل فروش کا منظر پیش کرتی ہے۔ کسی ایک لفظ کا بھی اپنی جگہ سے ہٹانا آراستگی کا خون کرنا ہے۔ مولانا کے قلم کی جنبش ادنیٰ گہرہائے آبدار رولتی، موتی پروتی، ہیرے تراشتی، گلوں میں رنگ بھرتی، گل کترتی اور لولوئے لالہ ڈھالتی ہے

اسلوب کے جلال وجمال نے ان کی تحریروں کو خلعت دوام عطا کیا ہے۔

بہت سے کوتاہ نظر اہل علم ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک صرف غواص معانی ہونا کافی ہے ان کے نزدیک اہمیت صرف مواد کی ہے ہیئت کی نہیں۔ میں نے کوتاہ نظر کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ قرآن کریم اعجاز بیان کا ایسا نادرۂ روزگار نمونہ ہے کہ آج تک کوئی اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورہ کی نقل بھی نہیں کر سکا عرب وعجم کے ماہرین زبان، ارباب فصاحت اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر رہے۔ قرآن کریم ادب کا شاہکار ہے تو ادب کو نظر انداز کرنا یا اسلوب کی اہمیت کو تسلیم نہ کرنا قلب ونظر کا فساد نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلوب اور ہیئت کے جمال کے بغیر جو تبحر علمی ہوتا ہے وہ بہت آسانی سے زمانہ کے دست برد کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں بہت سی کتابیں تبحر علمی کا شاہکار اور علم کا گوہر آبدار تھیں، لیکن وہ اپنے قاری سے اس لیے محروم رہیں کہ اس کی پیشکش میں اور انداز واسلوب میں کوئی ادائے دلبری اور کوئی دلنوازی موجود نہیں تھی اس کے برعکس بہت سی تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ان کی شہرت اور عزت اور مقبولیت دراصل ان کے حسن بیان اور طرز اظہار کی وجہ سے ہے۔ ورنہ ان کتابوں کا اپنا کوئی علمی وزن نہیں ہے، صرف ادب نے ان کو بقائے دوام اور قبولیت عام کی خلعت پہنائی ہے۔ اردو ادب کے حوالہ سے اگر یہ بات کہی جائے تو خود مولانا آزاد کی غبار خاطر کو سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کی تصنیفات میں سب سے زیادہ مقبولیت اسی کتاب کو حاصل ہوئی، لیکن اس کتاب کی مقبولیت کا راز اسلوب کے جمال اور انشاء پردازی کے کمال میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ اس کی تہ میں نہ کوئی درِ مکنون ہے نہ کوئی گوہر نایاب۔ انشاء پردازی کی قوت بے مثال نے چڑے اور چڑیے کی کہانی میں بھی حیرت انگیز کشش رکھ دی ہے۔ اور اسلوب کا جمال دل افروز دامن دل کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اگر یہی بات جدید عربی ادب کے حوالہ سے کہی جائے گی تو بہت آسانی کے ساتھ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی "الأیام" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین جدید عربی ادب کے سب سے زیادہ مشہور ادیب اور ناقد ہیں ان کی تصنیفات کا دنیا کی بیشتر اہم زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کی سب سے زیادہ مقبول

کتاب "الأیام" علمی وزن ووقار کے اعتبار سے ایک بہت معمولی کتاب ہے تمام انس وجن کی مجموعی طاقت کے ذریعہ بھی علم تحقیق کے چند قطرے کشید کرنا اس کتاب سے ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کے اسلوب کی دلکشی اور دلفریبی اور پیرایۂ اظہار کے حسن عالم آشوب کی وجہ سے اس کتاب نے ادب کی دنیا میں مقبولیت کا ایک رکارڈ قائم کردیا ہے۔

غبار خاطر مولانا کے عہد شباب کی نہیں بلکہ عہد پیری کی یادگار ہے، یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو قلعہ احمد نگر کے جیل سے مکتوب الیہ کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس میں انشائیہ نگاری ہے، حکایت زاغ وزغن ہے، چڑے اور چڑیا کی کہانی ہے۔ افسانۂ گل وبلبل ہے۔ سب کچھ ہے لیکن وہ آتش فشاں اسلوب نہیں ہے وہ گرمیٔ جذبات نہیں ہے وہ آہن گداز خطابت نہیں ہے، وہ خروش نعرہ پیکار نہیں ہے مولانا آزاد کی نثر جس کے لیے مشہور ہے اور مولانا کی شہرت جس سے وابستہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے اسلوب کی شان دلربائی میں یکسانیت نہیں بلکہ تعدد اور تنوع ہے نادرہ کاری اور جدت طرازی ہے، یہ مولانا کے طرز نگارش کی بے حد اہم خصوصیت ہے۔ غبار خاطر قیدخانہ کے اندر مولانا کی گل افشانی گفتار کا نمونہ ہے یہاں ذکر بہار اور یاد کاروان بہار ہی کی گنجائش نکل سکتی ہے ترجمان القرآن جیسی علمی تصنیف تیار نہیں ہوسکتی تھی جس کے لیے کتب خانہ درکار ہو۔ یہاں مولانا کتاب فطرت کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں حسن فطرت کو قلب ونظر میں اتارتے ہیں اور پھر اس کے رنگین جلوے اپنے موئے قلم سے دوسروں کو بھی دکھاتے ہیں اور مولانا کی نثر اپنی تمام رنگینیوں اور گل کاریوں کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

> "جس قید خانہ میں صبح مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے پرند ہر روز چہکیں اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش وعشرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھا جائے۔"

تذکرہ اور الہلال کے برعکس غبار خاطر میں سہل نگاری ہے، جملے عربی اور فارسی کی ترکیبوں سے بہت

زیادہ گراں بار نہیں اکثر مقامات پر زبان و بیان بے حد آسان ہے لیکن صنعت بیان یہاں بھی موجود اور معجزۂ فن کی قدم قدم پر نمود۔ نمونہ کے طور پر اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

"رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی، اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات چاروں طرف تاج کے مینارے سر اٹھائے کھڑے تھے برجیاں دم بخود بیٹھی ہوئی تھیں بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا، نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اوپر ستاروں کی انگنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں، نور و ظلمت کی اسی ملی جلی فضا میں اچانک پردہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے ہیں اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے ہیں۔ آسمان سے ستارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلیوں سے نغمے۔"

غبار خاطر کے برعکس تذکرہ اور اہلال کے اسلوب میں گھن گھرج اور جاہ و جلال کا رنگ ہے، غبار خاطر اگر جل ترنگ ہے تو اہلال اہورنگ، غبار خاطر میں جوئے نغمہ ریز کی نغمگی ہے تو اہلال میں آبشاروں کی تندی اور طغیانی، غبار خاطر میں دلکشی اور جمال ہے تو اہلال میں خطابت کا سحر حلال ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص فرازیٔ کوہ سے ایسے لہجہ میں خطاب کر رہا ہے جس میں خوابیدہ دل و دماغ کے لیے صدائے انقلاب اور پہاڑوں کے لیے رعشہ سیماب ہے۔ غبار خاطر میں اگر دلبری ہے تو اہلال میں دلبری کے ساتھ قاہری ہے۔ اہلال کے اسلوب میں ہی چونکہ ایک گونہ جلوہ جلال آفتاب پایا جاتا ہے اسی لیے جو لوگ صرف چاندنی رات کی نشاط انگیزیوں ہی کے طالب ہوتے ہیں عجب نہیں وہ اس آتش فشاں اسلوب سے ایک گونہ آزردگی کا شکار ہو جائیں اور یہ کوئی مفروضہ بھی نہیں ہے بہت سے ناقدین کو اہلال کے اسلوب پر نکتہ چیں بھی دیکھا گیا ہے اور وہ اس پر جوش اور مشکل اسلوب پر زبان حال سے شکوہ سنج تھے ؎

شب وصال میسر ہوئی مگر نہ ہوئی
کہ جوش حسن سے تھا وقت دوپہر کا سا

الہلال کا پہلا شمارہ منظر عام پر آتا ہے۔ اس کے پرجوش اسلوب سے متاثر ہو کر ایک قدرداں نے چک کے ذریعہ ایک رقم ارسال کی۔ مولانا کی طبع غیور نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ۲۷ر جولائی ۱۹۱۲ء کے شذرات میں لکھا:

"ہم خاک نشینانِ بوریائے مذلت مسند نشینان عزو جاہ کے بذل و عطا کے مستحق نہیں۔ ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں، صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں، عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈھتے ہیں، دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لیے آئے ہیں۔"

مولانا آزاد کے پیش رو اہل قلم میں محمد حسین آزاد اور علامہ شبلی بھی اپنی ہر عبارت کی تزئین و تحسین کا اہتمام کرتے تھے۔ علامہ شبلی کے یہاں سادگی کے ساتھ بلاغت پائی جاتی تھی لیکن دریائے ادب کے یہ دونوں "آزاد" عبارت آرائی کے طلسم میں پوری طرح مقید تھے۔ اور ان کو لفظوں کے انتخاب اور ان کی نشست اور موسیقیت کا بڑا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ جہاں تک اسلوب کے تنوع کا تعلق ہے مولانا آزاد کے یہاں زیادہ ہے۔ الہلال اور تذکرہ کا اسلوب غبار خاطر کے اسلوب سے مختلف ہے اور ترجمان القرآن کا اسلوب بیان ان دونوں اسالیب سے الگ ہے، ترجمان القرآن میں عالمانہ وقار کے ساتھ ساتھ تفہیم و تشریح کا آسان انداز پایا جاتا ہے مولانا ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں:

"تم دیکھتے ہو کہ فطرت ہر گوشۂ وجود میں اپنا قانونِ مکافات رکھتی ہے، ممکن نہیں کہ اس میں تغیر یا تساہل ہو، فطرت نے آگ میں یہ خاصہ رکھا ہے کہ جلائے۔ اب سوزش و تپش فطرت کی وہ مکافات ہو گئی جو ہر اس انسان کے لیے ہے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈالے گا۔ ممکن نہیں کہ تم آگ میں کودو اور اس کے مکافات سے بچ جاؤ۔ پانی کا خاصہ ٹھنڈک اور رطوبت ہے یعنی

ٹھنڈک اور رطوبت وہ مکافات ہیں جو فطرت نے پانی میں ودیعت کردی ہے۔
اب ممکن نہیں کہ تم دریا میں اترو اور اس کے مکافات سے بچ جاؤ۔ پھر جو فطرت
کائناتِ ہستی کی ہر چیز اور ہر حالت میں مکافات رکھتی ہے کیونکر ممکن ہے کہ انسان
کے اعمال کے لیے مکافات نہ رکھے۔ یہی مکافاتِ سزا و جزا ہے۔"

مولانا کی ادبی عظمت کا راز اس میں بھی ہے کہ انھوں نے کئی رنگ اور کئی آہنگ کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ترجمان القرآن میں ان کا اسلوب مسافرانِ جادۂ علم و تحقیق کے لیے سنگ میل ہے الہلال میں ان کا اسلوب خندۂ تیغِ اصیل ہے۔ لیکن اسلوب کی دلکشی اور رعنائی، اس کی عظمت اور اس کا وقار ہر جگہ قائم ہے خورشید زرنگار کے مانند جس کی تنویر صبح کے وقت بھی ہوتی ہے جب اس کی نقرئی کرنیں صفحۂ ہستی پر پھیلتی ہیں اور جس کی تابانی دوپہر ہی بھی ہوتی ہے جب اس کی تاب و تمازت کے عروج کا وقت ہوتا ہے اور جس کی روشنی شام کے وقت بھی ہوتی ہے جب وہ طشتِ افق سے لے کر لعل بدخشاں کے ڈھیر یا لالے کے پھول برساتا ہے۔

الہلال کی نثر کو بعض ناقدین ادب اور مورخین زبانِ اُردو نے بہت دشوار اور عربی اور فارسی کے ادق الفاظ سے گراں بار ثابت کرتے ہوئے اسے ناقابل قبول اور ناقابل اعتبار بھی ٹھہرا دیا ہے، لیکن اس تنقید کو ذہن و فکر کی کم مائیگی کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ یہ تنقید دراصل اپنی نارسائی کا اعتراف ہے۔ اگر صرف لفظوں کی سادگی اور سہل نگاری ہی پیمانہ ادب ہے تو پھر غالب اور اقبال کی شاعری کو بھی اس دائرے سے خارج کر دینا پڑے گا۔ غالب کی طرح اقبال بھی "نوائے سوختہ در گلو" اور "پریدہ رنگ و رمیدہ بو" جیسی مشکل ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی سادہ نثر ادب کے لیے کوئی متعین معیار نہیں۔ اسے "اُبالی ہوئی کھچڑی" کہنے کی جرأت تو نہیں کرنی چاہیے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ "ہزار شیوہ ہائے بتاں" کے مانند اسلوب کے بھی ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ جاذب نظر ہے۔

مولانا آزاد کا اسلوب کہیں آتش گل ہے، کہیں شعلۂ طور ہے، کہیں شاخِ گل ہے اور کہیں تلوار ہے۔ لیکن اس بوقلمونی کے باوصف بعض خصوصیات ہر جگہ یکساں ملتی ہیں۔ عربی زبان کے

کلمات کے حروفِ اصلیہ کی طرح جو تمام مشتقات میں شکل و وزن کی تمام تبدیلیوں کے باوجود باقی اور برقرار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی اصل شخصیت غیر منقسم ہوتی ہے اور اسلوب چونکہ انسان کی شخصیت کا پرتو حسن ہوتا ہے اس لیے اس کی اصل خصوصیات محل و موضوع اور رنگ و آہنگ کی تبدیلی کے باوجود غیر منقسم ہوتی ہیں اور تجربہ کے عمل کے ذریعہ انھیں ڈھونڈھ لیا جا سکتا ہے۔

نگارشات آزاد کے تفصیلی اور عمیق مطالعہ سے مولانا کے اسلوب کی خصوصیات کو متعین کرنا اور امتیازات کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ مولانا کے اسلوب کے عناصر ترکیبی ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی ہیں، وہ کیا خصوصیات ہیں جن سے ابوالکلام کی نثر عبارت ہے اور جن سے ان کے اسلوب کی تسکین اور تکمیل ہوئی ہے ان کا جاننا ادب کا مطالعہ کرنے والے اور نگارشات آزاد کا تجزیہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے۔ اسلوب کے تشکیلی عناصر حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ کمالِ حلم و وقار: مولانا کی کوئی عبارت مولانا کے مقام و مرتبہ سے فروتر نظر نہیں آئے گی۔ ان کے اسلوب کی جلالت ہر جگہ باقی اور برقرار رہتی ہے۔ اور کہیں بھی مبتذل انداز نہیں ملتا ہے۔ یہ بھی درحقیقت مولانا کی شخصیت ہے جو ان کے اسلوب میں ڈھل گئی ہے۔

۲۔ عربی فارسی شعر و ادب کے گہرے مطالعہ کے اثرات: مولانا کی شخصیت کی نشو و نما میں کلاسیکی ادب کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ مولانا کی والدہ ماجدہ عرب تھیں اور مدینہ منورہ کی رہنے والی۔ مولانا کے حافظہ میں قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کا ذخیرہ تھا۔ اسی طرح سے فارسی کے اشعار نوک زبان تھے اس لیے دونوں زبانیں ان کی شخصیت میں شیر و شکر ہو کر ان کے اسلوب کا جزء بن گئیں۔

۳۔ وسعت مطالعہ اور تبحر علمی:۔ مولانا اپنی زندگی میں شروع سے آخر تک اپنے ذوق کے اعتبار سے حافظ کے اس مصرعہ "فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے" کا مصداق رہے۔ ان کی تمام تصنیفات ان کی وسعت مطالعہ کی دلیل ہیں۔ ان کی تفسیر ترجمان القرآن خاص طور پر اس کی گواہ ہے۔ سورۂ کہف کی تفسیر میں ذوالقرنین کی بحث میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل

انوکھی اور نئی چیز تھی اور جس پر آج تک کوئی اہم اضافہ نہیں ہوسکا، دنیا کی تاریخ جغرافیہ اور آثار قدیمہ پر گہری نظر کے بغیر یہ داد تحقیق نہیں دی جاسکتی تھی یہ سارے مضامین علوم دینیہ کے ساتھ دوسرے سماجی علوم پر ان کی دستگاہ کا بیّن ثبوت ہیں۔ ہمہ وقت مطالعہ کے ذوق کی وجہ سے دنیائے سیاست میں رہ کر بھی وہ قافلۂ علم سے پیچھے نہیں رہے ہم رکاب رہے۔

۴۔ خیال آرائی اور فکر انگیزی: مولانا کے اسلوب میں شاعرانہ خیال آرائی اور فکر انگیزی کا عنصر بہت غالب ہے۔ اور ادب کا یہ بہت بنیادی وصف ہے۔ یہ ایک طرح کی موہبت ہے۔ اور اس موہبت خاص سے جن لوگوں کو نوازا جاتا ہے ان کے مزاج میں عزلت پسندی اور کم آمیزی رکھ دی جاتی ہے کہ اسی فضا میں اس کی نشوونما اور آبیاری ہوتی ہے۔ مولانا اپنے مزاج اور افتاد کے اعتبار سے عوامی زندگی کے آدمی نہ تھے۔ وہ بے ہمہ اور خود مشغول انسان تھے اور ان کی طبیعت اُردو کے اس شعر کے مصداق تھی۔

جائیے کس واسطے اے دردؔ میخانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

اور بیدلؔ عظیم آبادی کا فارسی کا یہ شعر بھی ان کے حسب حال تھا۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درا
تو زغنچہ کم نہ دمیدئی در دل کشا بچمن درا

۵۔ ایمان و اذعان کی کیفیت: مولانا کے اسلوب میں ایک طرح کی قطعیت، ایمان کی مضبوطی اور اذعان کی پختگی اور رجائیت پائی جاتی ہے۔ یہ اسلوب بھی ان کی طبیعت کی ثابت قدمی اور مزاج کے استقلال کی دلیل ہے۔ انھوں نے اپنے لیے جو بھی راہ طے کی اس میں عزیمت اور استقامت کا ثبوت دیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں کہیں شک اور تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت نہیں پائی جاتی وہ جس راہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں علی وجہ البصیرۃ دیتے ہیں۔

۶۔ خطابت اور جذبہ کی حرارت: مولانا کے اسلوب میں خطابت اور جذبہ کی شدّت اور حدّت

ملتی ہے جس کے بغیر خطابت کا وصف پیدا نہیں ہوتا ہے۔ الہلال اور تذکرہ میں یہ رنگ زیادہ گہرا ہے۔ ادب کے لیے کسی نہ کسی انداز میں اس وصف کا پایا جانا ضروری بھی ہے۔ آج کل کے بہت سے عقلیت پسند اس انداز پر منہ بناتے اور اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ جو لوگ بیان و تبیین کی بنیاد صرف خشک استدلال پر رکھتے ہیں ان کی تحریریں ان کے چوب قلم کی طرح خشک اور بے جان ہوتی ہیں۔

مولانا کے والد ضمیر الدین کے وابستگان عقیدت کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کو حلقۂ مریدین میں تقریروں کی دعوت بھی دی جاتی تھی۔ ان کا شمار واعظین اور مقررین میں ہوتا تھا۔ اس لیے خطابت کا جوہر مولانا کی شخصیت میں رچ بس گیا تھا۔ مولانا آزاد نے ۱۳ سال کی عمر سے جلسوں کو خطاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسہ میں ۱۹۰۴ میں انھوں نے ایک تقریر کی تھی جس میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی بھی موجود تھے۔ اس لیے خطابت اگر مولانا کے اسلوب کا ایک عنصر ہے تو اس میں تعجب کی بات نہیں ہے۔

۷۔ شانِ انانیت:۔ مولانا کے اسلوب میں نخوت و پندار اور انانیت کا رنگ بھی پایا جاتا ہے وہ اپنے اس اسلوب کی بدولت خاکدانِ ارضی کے بجائے اجرام سماوی کی سطح کی مخلوق نظر آتے ہیں ان کے یہاں تعلّیا نہ بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔ مولانا علمی اور فکری اعتبار سے زمانہ کی سطح سے بلند تھے اور انھیں خود بھی اس کا احساس تھا اسی احساس کی جھلک ان کے اسلوب اور طرز نگارش میں پائی جاتی ہے۔ گہری ادبیت اور گہری علمیت کی وجہ سے اسلوب کا یہ رنگ بھی بدنمائی نہیں پیدا کرتا ہے۔

۸۔ ذوق جمال اور ذکاوتِ حس:۔ ادیب و شاعر کا دوسروں سے زیادہ جمال سے اثر پذیر ہونا بدیہی بات ہے۔ شاعر کو شاعر کہتے ہی اس لیے ہیں کہ جمال کے سلسلہ میں اس کے شعور و احساس کی سطح دوسروں سے بلند ہوتی ہے۔ حسن خواہ ستاروں میں ہو یا گلزاروں میں ہو، طلوع سحر میں ہو یا نوا سنجانِ گلشن کی نغمہ سنجی میں ہو اگر خرمن دل پر بجلی بن کر نہ گرے اور ادیب و شاعر کی ذکاوت حس زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں کا بہت زیادہ اثر نہ قبول کرے تو ادب وجود

میں نہیں آسکتا ہے۔ مولانا کی نگارشات میں مولانا کی جمالیاتی حس بہت نمایاں ہے اور ان کے اسلوب کی دلبری کا راز اس میں پوشیدہ ہے۔ خود مولانا کہتے ہیں:

"حسن آواز میں ہو یا چہرہ میں تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں حُسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے، افسوس اس محروم ازلی پر جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو۔"

آخر میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ مولانا کا دلکش اسلوب جس کی داد تحسین دینے پر کہنہ مشق اہل قلم اور ان کے عہد کے ممتاز ادیب بھی مجبور ہو گئے وہ اچانک وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس کے پیچھے چودہ پندرہ سال کی ریاضت تھی۔ مولانا نے ۱۹۱۲ء میں الہلال نکالا تھا جس کے اسلوب سے لوگ دم بخود تھے، انگشت بدنداں تھے، یہ ایک ایسی صحافت تھی جس میں صحیفہ کا انداز تھا لیکن معجزۂ قلم کی اس نمود سے پہلے مولانا آزاد "الندوہ" میں شریک ادارت رہ چکے تھے "وکیل" کے مدیر رہ چکے تھے ـــــ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر بن چکے تھے "مخزن" میں مضامین بسر قلم کر چکے تھے "احسن الاخبار" میں کام کر چکے تھے اور ان سے پہلے "نیرنگ عالم" اور "المصباح" کو وسیلہ مشق قلم بنا چکے تھے۔ اس طویل ریاض کا ثمر شیریں تھا جو الہلال، تذکرہ، غبار خاطر اور ترجمان القرآن کی صورت میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ اور جس کی شیرینی لطافت، جمال اور جلال کا اعتراف اردو زبان کے مسلّم ادیبوں نے کیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے یہ اعتراف اس طرح کیا ہے:

"یہ بے مثل اسلوب جس میں عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں کے ساتھ شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی اور نطق اعرابی بھی ملتا ہے مولانا پر ختم ہو گیا۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے:

"انشاء پردازی کی طلسماتی دنیا میں اس سے زیادہ سحر آفریں نقش شاذ و نادر ہی صفحۂ قرطاس پر آئے ہوں گے۔"

پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا:

"ابوالکلام کے جوش قدح سے بزم ادب میں ہمیشہ چراغاں رہے گا۔"

مولانا ظفر علی خاں کہتے ہیں:۔

"مولانا ابوالکلام آزاد تفقہ فی الدین اور فہم معارف قرآن حکیم کے علاوہ فن انشا پردازی میں جو اسلوب بدیع رکھتے ہیں اور مبدأ فیاض سے جو ساحرانہ نطق انھیں ارزانی ہوا ہے اس کے لحاظ سے وہ ایک ایسے جامع حیثیات بزرگ ہیں جن کی نظیر پیش کرنے سے ہندوستان کی ساری اسلامی دنیا یکسر عاجز ہے۔"

علامہ سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہانت اور حافظہ کی غیر معمولی دولت اور قوت اظہار و بیان کی بے مثال فراوانی عنایت فرمائی ہے اور یہی ان کے خداداد فضل و کمال کے ایوان کے ستون ہیں ان کو جو کچھ ملا ہے وہ سراسر عطاء و موہبت ہے۔"

سجاد انصاری نے لکھا:

"مولانا ابوالکلام آزاد کا دماغ ان معجزات میں سے ہے جو کارکنانِ قضا و قدر کی حیرت انگیز کرشمہ طرازیوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ الہلال نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس طرح بیدار کر دیا جس طرح نفخ صور سے لاکھوں برس کے سوتے ہوئے انسان جاگ جائیں گے۔"

سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی نگارشات زبان حال سے کہہ رہی ہیں ؎

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نوا ہا کہ در گنبد گرداں زدہ ام

معجزۂ زبان و قلم کی سحر انگیزی کا اندازہ کرنے کے لیے کچھ اقتباسات پیش ہیں:

(۱)

"بڑے بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سر و سامان اور اسباب کار فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم و فاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سر و سامان نہیں تو اسے اپنے ہاتھ سے

تیار کرلوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیئے اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیئے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ درختوں کو دوڑنا چاہیئے اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہوگیا ہے کہ راہ صاف نہیں کرتے وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے وہ زمانوں کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھرلوں وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کروں۔"

(تذکرہ)

(۲)

" وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے اپنے ہر جلوے سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمے سے کانوں کو سرمستی کی پیہم دعوتیں دی تھیں اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ ہوشیاری و بینش کا مرقع تھا، بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا۔ پتّے پتّے کو مکتوب و مسطور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی، پنکھڑیوں نے اٹھ اٹھ کے اشارے کیئے۔ خاک پامال نے اڑ اڑ کر گہرافشانیاں کیں۔ آسمانوں کو بارہا اترنا پڑا کہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں سب نے نقاب اتار دیئے۔ سارے پردے چھلنی ہوگئے۔ سب کے ابروؤں میں اشارے تھے۔ سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری ہوئی تھیں۔" (تذکرہ)

(۳)

" میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا

چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکون کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا ہوں۔" (خطبۂ رام گڑھ)

آخر میں مولانا کی زلزلہ فگن خطابت کا رنگ دیکھنے کے لیے مولانا کی ایک پوری تقریر پڑھ لیجئے جو تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد جو قیامت خیز واقعات پیش آئے تھے اس نے مسلمانوں کو سراسیمہ اور خوف زدہ کر رکھا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد میں مسلمانوں کا جلسۂ عام تھا اور مولانا کا خطاب۔ جلسہ کے دوران بارش شروع ہوئی لیکن مولانا کی خطابت نے لوگوں کے قدم روک دیئے۔ یہ تاریخی تقریر مولانا کے خطیبانہ اسلوب کا بہترین نمونہ ہے۔

" عزیزانِ گرامی! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی تھیں تمہیں خطاب کیا تھا جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کے بجائے اعتماد۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔

تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں ہر خطرہ کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت اور انکار کی ساری سُنّتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج انھیں خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

"سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چُن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا؟ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سُنی ان سُنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں، وہ تقدیر جو تمہاری دماغی لغت میں مشیت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک

فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف اُلٹ دی گئی اور راہنمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کیے تھے وہ بھی دغا دے گئے حالانکہ تم نے سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے اور اُن ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مؤرخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہش کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی اور اس کی جگہ بُری شے آگئی۔ یہ واقعہ نہیں واہمہ ہے حقیقت یہ ہے کہ بُری شے چلی گئی اور اچھی شے آگئی۔ ہاں تمہاری بیقراری

اسی لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور بُری شے کو ہی نجات مادی سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھ میں تم نے مدّتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمرہی کا خطرہ درپیش آگیا ہے۔

میرے بھائی میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اور کبھی اس پرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں لیکن مجھے آج جو کہنا ہے میں اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر ابھی تک دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبت کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔ یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لیے تو موجب حیرت ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پہلے دن سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں سوچ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ اس خیال سے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے

بھیج دیئے ہیں۔ ہراس کا یہ موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کرسکتا۔

میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھالو اور بے عملی ترک کردو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے۔ اس پر غور کرو تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کا عادی بناؤ اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عامیانہ ہیں۔ آخر کہاں جارہے ہو اور کیوں جارہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کہاں گم کردیئے؟ ابھی کل کی بات ہے یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو، اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش وخروش بے جا تھا اسی طرح آج تمہارا خوف وہراس بھی بے جا ہے مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہوجانے سے ڈرو نہیں انھوں نے تمہیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہوگئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو سال پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا۔

"جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم"

ہوائیں گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں۔ لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ہے۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچّی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدلا ہے۔

آج ہم ایک دور انقلاب پورا کر چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور انھیں صفحوں میں زیب عنوان ہم بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہیں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیّر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو۔ جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمہیں اس

ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت نہیں بھگا سکتی۔

آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اسی کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو۔ کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اُجالا تھا۔ یہ بادلوں کے پانی کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرائے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو رُخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ چودہ سو سال پہلے کا نسخہ ہے وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔"

رئیس احمد نعمانی

# نیل المراد

## منظوم اردو ترجمہ

# قصیدہ بانت سعاد

اس گنہگار کی زندگی کا کتنا مقدس لمحہ تھا جب ذہن میں یہ خیال آیا کہ حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصیدہ بانت سعاد کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا جائے۔ یہ قصیدہ آج سے چودہ سو نو یا چودہ سو دس سال پہلے لکھا گیا تھا اور اس وقت سے آج دنیا کے تمام عربی جاننے والوں اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں میں مقبول و مشہور ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ اس میں اس ذات رفیع الدرجات کی مدح کی گئی ہے جس کے لیے خود خالق کائنات نے یہ فرمایا ہے کہ "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ"، دنیا کی مختلف زبانوں میں اس قصیدے کے متعدد ترجمے کیے گئے اور بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اردو میں بظاہر اب تک اس کا کوئی نثری یا منظوم ترجمہ شائع نہیں ہوا ہے۔ اور اللہ نے یہ سعادت اس سیہ کار کو نصیب فرمائی کہ پہلی بار اردو نظم میں اس مکمل قصیدے کا ترجمہ حبیب خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں کو ہدیہ نگاہ کر رہا ہے۔ اس قصیدے کی اس سے بڑی اہمیت کیا ہوگی کہ یہ پوری دنیا کے محترم و مکرم ترین انسان کی نعت میں کہا گیا ہے اور خود اس افصح العالم کے حضور میں پڑھا گیا اور بعض بعض اشعار پر اس بلاغت آموز جہاں نے تعریفی انداز میں شاعر کی طرف نگاہ اٹھائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ قصیدہ

لکھنے والا اسی جماعت کا ایک فرد ہے جس سے بہتر انسانوں کی جماعت اور ان کے ہمارے اور ساری دنیا کے سردار صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ یہی قصیدہ ہے جس کو سماعت فرما کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دوش مبارک سے اپنی مقدس چادر اتار کر بطور انعام حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ کو عطا فرمائی تھی جس کو بعد میں حضرت کعب کی اولاد سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی محبت وعقیدت رسول کے جذبے کے تحت چالیس ہزار دینار میں خرید کر حضورؐ کے تبرک کے طور پر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ حضرت کعبؓ قصیدہ بانت سعاد اور حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی ردائے مبارک کے متعلق انشاء اللہ یہ سیہ کار جلد ہی ایک مفصل مضمون لکھے گا۔ فی الوقت آپ مذکورہ قصیدہ اور اس کا منظوم اردو ترجمہ نیل المراد ملاحظہ فرمائیے۔

## حضرت کعب بن زہیرؓ

# قصیدۂ بانت سُعاد

(۱)

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول
متیّم إثرها لم یفد مکبول

(۲)

وما سعاد غداة البین إذ رحلوا
إلاّ أغن غضیض الطرف مکحول

(۳)

هیفاء مقبلة عجزاء مدبرة
لا یشتکی قصر منها ولا طول

(۴)

تجلو عوارض ذی ظلم إذا ابتسمت
کأنه منهل بالراح معلول

## اُردو ترجمہ

# نیل المراد

کہاں سعاد، ہیں بس راہ میں نقوش قدم
ہے قلبِ غم زدہ کس درجہ بیقرار نہ پوچھ
نہ پوچھ آج اسیرِ طلب کا حالِ زبوں
ہے کس بلا کی مصیبت فراقِ یار نہ پوچھ

---

دمِ وداع وہ اس کا کلام جاں پرور
متاعِ گوش ہے وہ لحنِ نغمہ زا، ابتک
نظر میں، باہمہ اندازِ دل رُبا یا نہ
ہے اس کی نرگسِ بیمار سرمہ سا ابتک

---

کرشمہ سازیِ ذہنِ صنم تراش نہ پوچھ
نظر کے سامنے ہے جیسے وہ سراپا ناز
وہ عضو، عضو، تناسب کی آئینہ داری
وہ اس کا قد کہ نہ کوتاہ اور حد سے دراز

---

وہ جاں نواز تبسّم وہ دل ربا دنداں
کرے بوقتِ تبسّم جب آشکارا انھیں
چمک ہو موتی سے بڑھ کر، ابھی ابھی جیسے
شرابِ ناب سے دھویا ہے بار بار انھیں

شراب ناب سے دھویا ہے بار بار انھیں

(۵)

شجت بذی شبم من ماء محنية
صاف بأبطح أضحى وهو مشمول

شراب جس میں ہو آمیزش آب صافی کی
وہ آب جو کہ تہہ جو بیار سے نکلے
ہوں سنگریزے تہہ آب اور چاشت کے وقت
خنک کریں اسے بادِ شمال کے جھونکے

(۶)

تنفى الرياح القذى عنه و أفرطه
من صوب سارية بيض يعاليل

ہوائیں دور کریں اس کے سب خس و خاشاک
سحر کے ابر کی بارش سے جو پیار بھرے
پھر اس کے آب میں مخلوط ہو وہ بادۂ ناب
جو اس کے دانتوں کو مانند برق چمکا دے

(۷)

أكرم بهاخلة لو أنها صدقت
موعودها ولوأن النصح مقبول

بہت ہی صاحب لطف و کرم ہو وہ دلبر
گر اپنے وعدۂ دیرینہ کا کرے کچھ پاس
اور اپنے سر نہ لے الزام بے وفائی کا
ہو کاش میری نصیحت کا بھی اسے احساس

(۸)

لكنها خلة قد سيط من دمها
فجع وولع و إخلاف و تبديل

مگر سرشت میں اس کی نہیں ہے یہ شامل
کہ اس کے دم سے وفا کا چراغ ہو روشن
ستانا اہلِ محبت کو اس کا شیوۂ خاص
فریب و وعدہ خلافی ہے اس کا جوہر فن

(۹)

فما تدوم على حال تكون بها
كما تلون فى أثوابها الغول

نہیں ہے اس کی طبیعت میں کچھ قرار و ثبات
کہ ایک حال پہ قائم وہ رہ سکے دم بھر
مزاج غولِ بیاباں کی مثل ہے اس کا
بدلتا رہتا ہے جو لمحہ لمحہ شکل دگر

(۱۰)

ولا تمسك بالعهد الذى زعمت
إلا كما تمسك الماء الغرابيل

نہیں ہے وعدہ و پیماں کا اعتبار اس کے
کہ اہلِ حسن کا شیوہ نہیں وفاداری
مثال عہدِ وفا کی جو اس کے سچ پوچھو
تو اس طرح سے ہے چھلنی میں جس طرح پانی

(۱۱)

فلا يغرنك مامنت وما وعدت
إن الأمانى والأحلام تضليل

نہ کھا فریب تمنّا، نہ دیکھ وصل کے خواب
کہ خواب و آرزو کرتے ہیں نفس کو گمراہ
ہے اہل حسن کا وعدہ تمام مکر و فریب
بھرے ہے ان کا گرفتار، زندگی بھر آہ

(۱۲)

كانت مواعيد عرقوب لها مثلا
وما مواعيدها إلا الأباطيل

مثال وعدۂ عرقوب[1] ان کے وعدے ہیں
جو مکر و وعدہ خلافی میں تھا بہت ماہر
ہمیشہ ہوتی ہے دل میں تو بات ان کے کچھ اور
مگر اداؤں سے کرتے ہیں اور کچھ ظاہر

(۱۳)

أرجو و آمل أن تدنو مودتها
وما إخال لدينا منك تنويل

یہ آرزو تھی کہ ہو جائے مجھ پہ وہ شیدا
ہوں ایک عرصے سے جس طرح میں فدا اس پر

مگر یہ وہم تھا، اور صرف وہم تھا میرا
کہ التفات و نوازش کسی کی ہو گی اِدھر

(۱۴)

أمست سعاد بأرض لا تبلغها
إلا العتاق النجيبات المراسيل

سعاد پہنچی ہے ایسی جگہ پہ شام کے وقت
جہاں کوئی بھی نہ پہنچا سکے بہ آسانی
سوا، ان اونٹوں کے، بے عیب جن کی ہوں نسلیں
جمال و تیز روی میں نہ جن کے ہوں ثانی

(۱۵)

ولن تبلغها إلا عذافرة
فيها على الأين إرقال و تبغيل

وہ سرزمین، جہاں پہنچا نہیں سکے گا کوئی
سوا، ان اونٹوں کے جو ہوں قوی و سخت اقدام
وہ ناقہ جو کہ سفر خستگی کے حال میں بھی
رہے بہ جانب منزل ہمیشہ گرمِ خرام

(۱۶)

من كل نضاخة الذفرى إذاعرقت
غرضتها طامس الأعلام مجهول

وہ ناقہ قوم میں اپنی جو سب سے ہو ممتاز
چلے جو تیز قدم بے نشان راہوں میں
عرق فشاں دمِ رفتار اس کے گوش و جبیں
ہو اس کے حوصلے کا امتحان راہوں میں

(۱۷)

ترمى الغيوب بعيني مفردلهق
إذا توقدت الحزان والميل

نگاہیں اس کی ہوں یوں جستجوئے منزل میں
تپے ہوں دھوپ سے جب کوہ و دشت و ریگستان
کہ جس طرح کوئی جنگلی سفید رنگ کا بیل
بچھڑ کے گلے سے اس کے لیے ہو سرگرداں

ضخم مقلدها عبل مقيدها
فی خلقها عن بنات الفحل تفضيل

وہ ناقہ، حسن ہے گردن کا فربہی جس کی
اور اسکے پاؤں بھی ہوں فربہی سے حسن پذیر
جو اپنی ساخت میں بہتر ہے سارے اونٹوں سے
شرف میں جس کے نہیں ہے کسی طرح تقصیر

(۱۹)

---

غلباء و جناء علكوم مذكرة
فی دفّها سعة قدامها ميل

بلند اس کی ہے گردن، کلاں ہیں رخسارے
ہے مثل نر کے توانا، اگرچہ مادہ ہے
وہ تیز بیں ہے، حضر ہو کہ ہو سفر، اس کی
حدِ نگاہ میں ہر اک نشانِ جادہ ہے

(۲۰)

---

وجلدها من أطوم مايؤبسه
طلح بضاحية المتنين مهزول

ہے سنگ پشت کی مانند اس کی پشت کی جلد
بہت ہی سخت، چمکدار اور بہت ہموار
کہ جس پہ چیچڑی چمٹنے میں کامیاب نہ ہو
اگرچہ بھوک سے چیچڑی کو ہو نہ صبر و قرار

(۲۱)

---

حرف أخوها، أبوها من مهجنة
و عمها خالها قوداء شمليل

مثال کوہ بلند اور سخت اس کا بدن
دراز گردن و پشت اور تیز ہے رفتار
کہ اس کا باپ ہے بھائی، تو ہے چچا ماموں
ہے جو سے اس کو بہائم میں اعتبار و وقار

(۲۲)

---

يمشی القراد عليها ثم يزلقه
منها لبان وأقراب زهاليل

بدن پر اس کے اگر چڑھتی ہے کبھی چیچڑی
پھسل کے گرتی ہے فوراً زمین کے اوپر

کہ اس کے سینہ و پہلو ہیں اس قدر چکنے
کہ ٹک سکے نہ کوئی شے بھی ان پہ سرتا سر

(۲۳)

عیرانة قذفت بالنحض عن عرض
مرفقها عن بنات الزور مفتول

ہے چال اس کی کسی جنگلی گورخر کی طرح
پھر اس پہ فربہی کا عجیب عالم ہے
ہے ہر طرف سے وہ پر گوشت اس طرح کہ جدا
ہمیشہ کہنیاں رہتی ہیں اس کی پہلو سے

(۲۴)

کانما فات عینیها و مذبحها
من خطمها و من اللحیین برطیل

منہ اس کا ناک کے نتھنوں سے دونوں کانوں تک
کہ جیسے سانچے میں ڈھالا گیا ہو سنگ دراز
اسی صفت سے ہے موصوف اس کی گردن بھی
مقام خلق سے کلّوں تک ایک ہے انداز

(۲۵)

تمر مثل عسیب النخل ذاخصل
فی غارز لم تخونه الأحالیل

دُم اس کی ہلتی ہے اس طرح سے بوقتِ خرام
کہ شاخ خرمے کی جیسے ہوا کے جھونکوں سے
نتھنوں کے حسن سے کھلواڑ کر رہی ہے وہ
سجی ہوئی ہے جو خود دل فریب بالوں سے

(۲۶)

قنواء حرتیها للبصیر بها
عتق مبین و فی الخدین تسهیل

ہے ناک اس کی محدّب تو نرم ہیں رخسار
کشش ہے آنکھوں میں بھی چشم دیدہ ور کے لیے
اور اس کے کانوں کے مابین ایک تابشِ خاص
دلیلِ اصل ہے ہر صاحب بصر کے لیے

تخدی علی یسرات وهی لاحقة
ذوابل مسّهن الأرض تحليل

ہیں ٹانگیں اس کی بہت نازک اور بہت ہی سبک
زمین پر جنھیں رکھتی ہے کم دمِ رفتار !
مگر وہ ساری نزاکت کے باوجود اپنی
پہنچ ہی جاتی ہے منزل پہ مثل بادِ بہار

(۲۸)

---

سمرالعجايات يتركن الحصى زيما
لم يقهن رؤس الاكم تنعيل

وہ پاؤں، پنڈلیاں جن کی ہیں سرخ گندم گوں
وہ جب چٹانوں پہ ہوتے ہیں وقف تیز روی
ہٹاتے جاتے ہیں قدموں سے سنگریزوں کو
کہ احتیاج نہیں ان کو نعل کو بی کی

(۲۹)

---

كأن أوب ذراعيها إذا عرقت
وقد تلفع بالقور العساقيل

کماں پاؤں کی گردش اس کے ہو ظاہر
تپش سے مہر کی جس دم پسینہ آتا ہو
پہاڑیاں نظر آئیں سراب کی مانند
پیاسا آدمی گرمی سے بلو کھلاتا ہو

(۳۰)

---

يوما يظل به الحرباء مصطخدا
كأن ضاحيه بالشمس مملول

زمین دھوپ سے جس روز خوب تپتی ہو
مثال آتش سوزاں ہو ریت کی حالت
چلے گرا اس پہ، جھلس جائے آفتاب پرست
مجال کیا کسی انسان کو ملے راحت

(۳۱)

---

و قال للقوم حاديهم وقد جعلت
ورق الجنادب يركضن الحصى قيلوا

کہے یہ قوم سے ایسے میں ساریاں ان کا
ہے دھوپ تیز، بھری دوپہر ہے، کچھ سولو

کہ ٹڈیاں بھی تمازت میں اڑ نہیں پاتیں
تو سنگریزوں سے ٹکرا رہی ہیں پنجوں کو

(۳۲)

شد النهار ذراعا عيطل نصف
قامت فجاوبها نكد مثاكيل

اسی فضا میں ہیں پاؤں اس کے اسطرح جیسے
کسی ادھیڑ سی عورت کے لمبے لمبے ہاتھ
کہ جس کے بچے کئی مر چکے ہیں، اس غم میں
وہ مل کے روتی ہے ایسی ہی عورتوں کے ساتھ

(۳۳)

نواحة رخوة الضبعين ليس لها
لما نعى بكرها الناعون معقول

کسی نے جب سے سنائی ہے آکے اس کو خبر
کہ تیرا لختِ جگر چل بسا ہے دنیا سے
نہیں ہے اس کو کسی حال میں بھی صبر و قرار
سراپا نوحہ و فریاد و آہ و زاری ہے

(۳۴)

تفرى اللبان بكفيها و مدرعها
مشقق عن تراقيها رعابيل

وہ دونوں ہاتھوں سے مصروف سینہ کوبی ہے
ہوا ہے جس سے گریباں بھی تار تار اس کا
سکون کس طرح ہو سکتا ہے اسے حاصل
کہ لٹ چکا سبھی سرمایۂ قرار اس کا

(۳۵)

تسعى الوشاة جنابيها و قولهم
إنك يا ابن أبى سلمى لمقتول

اس اونٹنی کے دو جانب تھے دشمنوں کے گروہ
جو تیز دوڑتے جاتے اور کہتے تھے
کہ تیرے قتل کا یثرب میں ہو چکا اعلان
خبر ہے کچھ؟ ابو سلمی کے خوش نوا پوتے!

(۳۶)

وقال کل خلیل کنت آمله
لا ألهینك إنی عنك مشغول

کلام سرورِ عالمؐ کی کیا کہوں تاثیر
کہ دشمنوں کو بھی جس پر یقین کامل تھا
ہر ایک دوست، تھی جس سے مجھے امید وفا
وہ میرے سایے سے بھی دوریوں پہ مائل تھا

(۳۷)

فقلت خلوا سبیلی لا أبا لکم
فکل ماقدر الرحمٰن مفعول

یہ حال دیکھ کے میں نے کہا یہ لوگوں سے
کہ تم سبھی مرے رستے سے آج ہٹ جاؤ
میں جا رہا ہوں بہ سوئے مدینہ بے پروا
جو کچھ خدا نے مقدر کیا ہے ہونے دو

(۳۸)

کل ابن أنثی و إن طالت سلامته
یوما علی آلة حدباء محمول

کہ اس جہاں میں پیدا ہوا ہے جو بھی کوئی
ہو اس کی زندگی کچھ روز، یا کہ سالہا سال
ہر اک کا جانا ہے اک دن جنازہ گورستان
یہی ہے سب کا مقدر، یہی ہے سب کا مآل

(۳۹)

أنبئت أن رسول الله أوعدنی
والعفو عند رسول الله مأمول

خبر ملی ہے کہ مجھ کو ہلاک کرنے کی
ہوئی ہے عام اجازت، لب رسالت سے
مگر، مرا دلِ امیدوار رکھتا ہے
امیدِ عفو و کرم، درگہہ نبوّت سے

(۴۰)

تو بے شک آج رسولؐ خدا کی خدمت میں

فقد أتيت رسول الله معتذرا
والعذر عند رسول الله مقبول

میں لے کے آیا ہوں عذر خطا کا عزم صمیم
مجھے یقیں ہے، مری معذرت بھی ہوگی قبول
خدا گواہ کہ سرکارؐ ہیں رؤف و رحیم

(۴۱)

---

مهلا هداك الذى أعطاك نافلة ال
قرآن فيها مواعيظ و تفصيل

رسول پاک، عطا کیجئے مجھے مہلت
خدا کی خاص ہدایت ہو آپ کو حاصل
کہ جس سے آپ کو قرآن سی کتاب ملی
نصیحت اور بیانات جس کے ہیں کامل

(۴۲)

---

لاتأخذنى بأقوال الوشاة ولم
أذنب و إن كثرت فى الأقاويل

نہ باز پرس کریں مجھ سے آپ شاہِ رُسل
کسی بھی طرح مرے دشمنوں کے کہنے سے
ہوئی نہ مجھ سے خطا کوئی شانِ اقدس میں
گڑھے ہیں لوگوں نے سارے یہ جھوٹے افسانے

(۴۳)

---

لقد أقوم مقاما لو يقوم به
أرى وأسمع مالو يسمع الفيل

کھڑا ہوں آج میں ایسے مقام پر کہ اگر
کھڑا ہو میری جگہ پر یہاں کوئی ہاتھی
میں دیکھتا ہوں جو کچھ اور جو میں سنتا ہوں
وہی اسے بھی نظر آئے، اور سنے وہ بھی

(۴۴)

---

لظل يرعد إلا أن يكون له
من الرسول بإذن الله تنويل

تو وہ بھی مجھ کو یقیں ہے، لرز لرز جائے
رسول پاکؐ کے پاکیزہ رعب و ہیبت سے
مگر کہ حکم خدا سے ملے اماں اس کو

رسولِ اکرم و اعظم کے لطف و رحمت سے

(۴۵)

حتی وضعت یمینی لاأنازعه
فی کف ذی نقمات قیله القیل

یہ انتہا ہے کہ ادنیٰ منازعت کے بغیر
میں اپنے ہاتھ کو دیتا ہوں، ہاتھ میں انؐ کے
وہ جن کی شان ہے دنیا میں آج سب سے بلند
ہے قول، "قول"، جو نکلے لبِ مبارک سے

(۴۶)

لذك أهیب عندی إذ أکلمه
وقیل إنك منسوب و مسئول

یہ اس لیے کہ ہوئی گفتگو جب آقاؐ سے
تو تھا بہت ہی میں ہیبت سے ان کی خوف زدہ
کہا گیا تھا کہ ہے کعب، تجھ پہ، وہ الزام
بجا ہے حال پہ تیرے اگر کریں گر یہ

(۴۷)

من خادر من لیوث الأسد مکنته
من بطن عثر غیل دونه غیل

مری نگاہ میں ہیبت تھی آپ کی بڑھ کر
اک ایسے شیر سے، شیروں کا شیر جس کو کہوں
وہ جس کی جائے سکونت ہو ایسے جنگل میں
گھنیرے پن میں جو ہو سارے جنگلوں سے فزوں

(۴۸)

یغدو فیلحم ضرغامین عیشهما
لحم من القوم معفور خرادیل

وہ شیر جو کہ بوقت سحر شکار کرے
اور اپنے بچوں کو دے ان کی دل پسند غذا
غذا ہے جن کی انسان کا تازہ تازہ گوشت
جو ریزہ ریزہ بساطِ زمین پر ہو پڑا

(۴۹)

إذا يساور قرنا لا يحل له
أن يترك القرن إلاوهو مغلول

(۵۰)

وہ شیر نر کہ جو حملہ بپھر کے کرتا ہے
خود اپنے جیسے ہی شیر نر و توانا پر
تو چھوڑتا نہیں ہرگز فریق ثانی کو
مگر شکست، شکست اور شکست ہی دے کر

---

منه تظل سباع الجو ضامزة
ولا تمشى بواديه الأراجيل

(۵۱)

وہ شیر جس کے ہراس اور رعب و دہشت سے
درندے دشت کے سب ہوں نحیف اور لاغر
شکاری کیسے ہی ماہر ہوں صید کرنے میں
ہے کس میں تاب کہ وادی سے اسکی جائے گزر

---

ولا يزال بواديه أخوثقة
مطروح البز والدرسان مأكول

(۵۲)

ہمیشہ ملتا ہے وادی میں اس کی کوئی شجاع
پڑا ہوا کسی کھائی ہوئی غذا کی طرح
زمین پر کہیں بکھرے ہیں اسلحہ جس کے
کہیں لباس پڑا ہے پھٹی ردا کی طرح

---

إن الرسول لنور يستضاء به
مهند من سيوف الله مسلول

(۵۳)

ہے ایک نور بلاشک رسولؐ کی ہستی
جہاں میں جس سے سبھی کر رہے ہیں کسب ضیا
خدا کی تیغوں میں سے ایک تیغ ہندی ہے
نیام سے جو چمکتی ہے اپنی ہو کے جدا

---

فى عصبة من قريش قال قائلهم
ببطن مكة لما أسلموا زولوا

رسول ماہِ ہدایت، قریش تھے ہالہ
ہوئی سعادت اسلام جب نصیب انھیں

کہا تھا ان میں سے یہ ایک کہنے والے نے
کہ مکّہ چھوڑ کے ہجرت سوئے مدینہ کریں

(۵۴)

---

تو شہر مکّہ سے وہ ٹل گئے ، مگر نہ ٹلا
کوئی بھی ان میں کا کفّار کے مقابل سے
وہ چاہے کیسا ہی کمزور اور نہتا ہو
رہا ہے معرکہ آرا ہجومِ باطل سے

زالوا فمازال أنكاس ولاكشف
عند اللقاء ولا ميل معازيل

(۵۵)

---

بلند و بالا ہیں وہ اونچی ناک والے ہیں
نہیں جواب زمانے میں جن کی جرأت کا
ہیں گویا پیرہنِ جنگ ان کا وہ زرہیں
کہ جن کو حضرتِ داؤدؑ نے بنایا تھا

شم العرانين أبطال لبوسهم
من نسج داؤد فى الهيجا سرابيل

(۵۶)

---

وہ صاف زرہیں کہ ہیں رنگ جن کے تیز سفید
جو اپنی خوبیٔ صنعت سے ہیں درخشندہ
اور ان میں حلقے بھی ہیں جس طرح کہ قفعا میں
ہر ایک حلقہ ہے اک دوسرے سے پیوستہ

بيض سوابغ قد شكت لها حلق
كأنها حلق القفعاء مجدول

(۵۷)

---

وہ ایسے لوگ ہیں جن کو نہ فخر ہو نہ خوشی
جب ان کے نیزے کسی قوم پر برستے ہیں
ہو ان پہ وار تو فریاد بھی نہیں کرتے
کہ مرگ و زیست ختم ان پہ سب سلیقے ہیں

لايفرحون إذا نالت رماحهم
قوما وليسوا مجازيعا إذا نيلوا

| | |
|---|---|
| يمشون مشى الجمال الزهر يعصمهم ضرب إذا عرد السود التنابيل | سفید اونٹوں کی مانند چلتے ہیں وہ لوگ اور ان کی ضرب حفاظت کا کام کرتی ہے فرار کرتے ہیں ان کے مقابلے سے جب وہ جن کے چھوٹے ہیں قد اور شکل کالی ہے |

(۵۹)

| | |
|---|---|
| لايقع الطعن إلا فى نحورهم وما لهم عن حياض الموت تهليل | انھیں کے سینے ہیں آماجگاہ نیزوں کی کہ موت بھی نہیں کر سکتی ہے انھیں پسپا وہ پیچھے ہٹتے نہیں موت کے مقابل سے جری بناتا ہے جذبہ انھیں شہادت کا |

## حواشی:۔۔۔۔

۱۔عرقوب، عرب میں ایک شخص گزرا ہے جو انتہائی وعدہ خلاف تھا اور اس کا نام وعدہ خلافی کے لیے ضرب المثل بن گیا ہے۔

۲۔ یہ مضمون بہت ہی عجیب سا اور انسانوں کے سلسلے میں یقیناً انتہائی شرمناک ہے لیکن جانوروں اور مخصوصاً اونٹ کے سلسلے میں یہ بات اس کی خوبی، قوت اور شرافت سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنی نسل کی قریب ترین اونٹنی سے بارداری کے نتیجے میں وجود پذیر ہوا ہو۔

۳۔ آفتاب پرست: گرگٹ

۴۔ایسی ہی عورتیں یعنی جن عورتوں کے اسی کی طرح بچے مر چکے ہوں۔

۵۔ اصل عربی شعر میں ابن ابی سلمیٰ ہے جس کے معنی ہیں ابو سلمیٰ کا بیٹا، یہاں حضرت کعبؓ کے ضرورت شعری کی وجہ سے ابن زہیر کی جگہ ابن ابی سلمیٰ نظم کیا ہے مراد خود حضرت کعبؓ ہیں جو ابو سلمیٰ کے پوتے تھے، اسی لیے ترجمے میں "پوتے"

لکھا گیا ہے۔

۶۔ ایک کہنے والے سے مراد یہاں پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں ان کے نام اور مشورۃ ہجرت کی صراحت تاریخ کی کتابوں موجود ہے۔

۷۔ ٹل گئے، یعنی مصلحتاً اور بحکم خداوندی مکّہ سے مدینہ کو ہجرت کر گئے، مگر جہاد پر برابر اٹل رہے اور کفار کے چھکے چھڑاتے رہے۔

۸۔ قفعاء: ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے جس کی ڈنڈیوں میں انگوٹھی کی طرح کے حلقے ہوتے ہیں اور ان حلقوں کے کنارے ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں۔

حنیف اسعدی

# نعت

کوئی ان کے بعد نبی ہوا، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں
کہ خدا نے خود بھی تو کہہ دیا، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں

کوئی ایسی ذات ہمہ صفت، کوئی ایسا نور ہمہ جہت
کوئی مصطفیٰ، کوئی مجتبیٰ، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں

بجز ان کے رحمت ہر زماں، کوئی اور ہو تو بتائیے
نہیں ان سے پہلے کوئی نہ تھا، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں

کسی ایسی ذات کا نام لو، جو امیں بھی ہو جو اماں بھی ہو
یہ مرے یقیں کا ہے فیصلہ، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں

یہ نگار خانۂ روز و شب، اسی مبتدا کی خبر ہے سب
مگر ایسا جلوۂ حق نما، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں

یہ سوال تھا کوئی اور بھی ہے گناہگاروں کا آسرا
تو رواں رواں یہ پکار اٹھا، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں

وہ قدم اٹھے تو بیک قدم ہمہ کائنات تھی زیر پا
یہ بلند یا کوئی چھو سکا، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں

مغیث الدین فریدی

# غزل

عزمِ ترکِ طلب دل میں پیدا ہوا ان سے ملنے کی اک آرزو کی طرح
اب جنوں میں بھی رنگِ شعور آگیا چاک کرتے ہیں دامن رفو کی طرح

ہم ہی مارے گئے ہم ہی رسوا ہوئے تیرے دامن پہ کوئی بھی دھبہ نہیں
جم گئی ہے مگر دامنِ وقت پر یہ وفا دشمنی بھی لہو کی طرح

وقت کے ساتھ قدریں بدلتی رہیں مصلحت ہر قدم پر ڈبوتی رہی
عزتِ دل اگر یوں ہی سوتی رہی جان بھی جائے گی آبرو کی طرح

حکم یہ ہے کہ رنگ شکستہ بھی اب ترجمانِ غم و دردِ ہستی نہ ہو
بے زبانی پہ پابندیاں لگ گئیں آپ کی بزم میں گفتگو کی طرح

ہے فریدی تقاضائے رنگِ غزل ذہن کی روشنی روح کی تازگی
شعلہ احساس کا پیکرِ حرف میں ڈھل کے نکھرے کسی شعلہ رو کی طرح

مصطفےٰ کمال۔گورکھپور

# ٹوٹے رشتے

نرسنگ ہوم کی اوپری منزل پر چڑھتے ہوئے چنّو کے ماں باپ نے ایک دوسرے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا۔شوہر نے کہا۔

"گھر خبر کرنا ضروری ہے"

"میرے بھی گھر خبر کرا دیجئے" بیوی نے کہا۔

"کون آئے گا" شوہر نے پوچھا۔

بیوی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول دیں جس میں آنسوؤں کی نمی تھی اور بے چارگی کا احساس۔اس نے گردن جھکالی اور چنّو کو گردن سے لگائے ہوئے شوہر کے پیچھے پیچھے ہولی۔

چنّو کی حالت خراب ہو رہی تھی۔شوہر سفید بیڈ پر چنّو کو لٹا کر اسے چپ کرانے لگا۔ چار سالہ بچّہ بے حال اور بیقرار تھا۔وہ بلند آواز میں چیخے جا رہا تھا۔اس کی بے چینی بتا رہی تھی کہ وہ بے حد تکلیف میں ہے۔وہ ہاتھ پیر پٹک رہا تھا۔سر جھٹک رہا تھا۔

"سر دبا دوں" ماں سر پر ہاتھ لے جاتی۔وہ پیر پٹکنے لگتا۔وہ پیر سہلانے لگتی۔اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔بچّہ پیر پٹک کر ماں کو بھگانے لگا۔باپ کو پکارنے لگا۔

"بیٹا۔وہ ڈاکٹر کو بلانے گئے ہیں" ماں نے بیٹے کو دلاسا دینا چاہا۔

"نہیں... بلاؤ" لڑکا ہذیانی انداز میں چیخا۔

"لو دوا کھالو" ماں بولی۔

"نہیں کھاؤں گا" لڑکے کی چیخ اور بلند ہو گئی۔

"لاؤ بخار ناپ لیں" ماں نے تھرمامیٹر لگانا چاہا۔

"نہیں۔ ابّو کو بلاؤ"

"بیٹا ابو تمہارے لیے دوا لینے گئے ہیں، ابھی آتے ہوں گے"

"دیکھو.... بڑے ابّو آگئے"

اس کے پیچھے لڑکے کا باپ بھی اپنے بھائی کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

"مجھے ڈاکٹر کے یہاں معلوم ہوا۔ وہیں سے بھاگا آرہا ہوں" چنّو کے بڑے باپ نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"کیسا ہے چنّو" بڑے باپ نے چنّو کی نبض دیکھی۔ پیشانی پر ہاتھ رکھا اور چنّو کی ماں کو دیکھا۔

"بھیّا اک بک کر رہا ہے۔ ایک سوئی لگی ہے۔ بخار ایک سو چار ہے" چنّو کی ماں نے بتایا۔

ابھی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں، وہ کہہ کر مڑا ہی تھا کہ ڈاکٹر خود ہی آگیا۔ اس نے بچّہ کے سینہ کا بڑی دیر تک معائنہ کیا۔ چنّو کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ سانس بے ربط تھی۔ اس نے کمپاونڈر کو ہدایت کی۔ گلوکوز لگا دو" اس کا بڑا باپ صحیح حالات جاننے کے لیے ڈاکٹر کے ساتھ ہولیا۔

یہ نرسنگ ہوم کا بچّہ وارڈ تھا۔ اس میں تین بیڈ تھے۔ ایک بیڈ پر ایک عورت اپنے بچّے کی تیمارداری کرتے ہوئے آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے بچّے کو بھی گلوکوز چڑھ رہا تھا اس کے بیڈ کے ارد گرد کنبہ کے بہت سے افراد بچّے پر نگاہ گاڑے کھڑے تھے۔ کمپاونڈر بار بار اندر باہر آرہا تھا۔ اسے کئی بار ڈاکٹر بھی دیکھ کر جا چکا تھا۔

چنّو کو گلوکوز لگانے کے لیے اسٹینڈ لگا دیا گیا۔ بچّے کی نس نہیں مل رہی تھی، کمپاونڈر بار بار سوئیاں چبھو رہا تھا۔ ماں باپ بچّے کا ہاتھ دبائے ہوئے تھے۔ تکلیف کے سبب اس کا ہاتھ اینٹھا جا رہا تھا۔

"گھر لے چلو، چچی کو بلاؤ" چنّو چیخا۔

"تم اچھے ہو جاؤ تو ہم گھر چلیں گے" ماں نے نرمی سے کہا۔

"نہیں.... گھر چلو، گھر چلو" چنّو چیخا۔

ڈاکٹر نے برف کی پٹی رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ باپ برف لینے چلا گیا تھا، پھر بھی بغل کے بیڈ والوں نے برف کا ایک ٹکڑا فراہم کر دیا تھا۔ ماں بار بار پٹی بدلنے لگی۔ ڈاکٹر نے گلے کی کھڑکھڑاہٹ پر کافی توجہ دی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ بلغم زیادہ نہ رکنے پائے اس کا نکلنا ضروری ہے۔ آواز پھنسنے لگے تو مشین منگوا کر گلا صاف کرا دیجئے گا۔

"چچی کو بلاؤ" چنّو چیخا۔

"چچی آ رہی ہیں" ماں نے دلاسہ دیا۔

"نہیں بلاؤ" تب چچی بھی داخل ہوئیں۔ انھوں نے جھٹ سے نقاب اتارا اور چنّو کی بغل میں بیٹھ گئیں۔

چنّو ایک ٹک اپنی چچی کو دیکھتا رہا۔ جس کی پلکوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ چنّو کی تکلیف سے بہت زیادہ متأثر نظر آ رہی تھی۔

"بھیّا کہاں گئے" ڈاکٹر کو بلاؤ" چچی نے کہا۔

ڈاکٹر آ کر جا چکا ہے۔ بھیّا ڈاکٹر کے ساتھ دوا لینے گئے ہیں۔ چنّو کی ماں نے جواب دیا۔

چنّو کی چچی نے جلدی جلدی سر کی پٹیاں بدلنا شروع کیں اور کپڑا بھگو کر پیروں کو دھونا شروع کیا۔

"ہم لوگ گھر پر انتظار کر رہے تھے" چچی نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

بچّہ نے چچی کو سامنے دیکھا۔ اب اس نے اس کا نام لینا چھوڑ دیا۔ اب اس نے دادا کی رٹ لگانا شروع کر دی۔ وہ بھی آ رہے ہیں" چچی نے چنّو کو دلاسہ دیا اور چنّو کی ماں سے کہا ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، سینے کا درد زیادہ ہے اس لیے چنّو کی بیماری کے بارے میں انھیں نہیں بتایا گیا۔

باپ برف لے آیا۔ چنّو کی چچی نے اسے توڑ کر برف کا ایک ٹکڑا جگ میں ڈالا۔ باقی برف

لپیٹ کر کنارے رکھ دیا۔

بغل کے پلنگ پر جو بچہ پڑا تھا، وہ بالکل ساکت تھا۔ اس کی سانس کی رفتار اس کی زندگی کا ثبوت فراہم کر رہی تھی۔ پلنگ کے چاروں طرف کھڑے مردوں اور عورتوں کی نگاہیں بچے کے چہرے پر مرتکز تھیں۔ جنّو کی چچی نے بھی جھانکا۔ لڑکا خوبصورت اور تندرست تھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھیں اس کی بیماری کا پتہ دے رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ اس کا بخار تین دن سے نہیں اترا۔ جب تک طاقت تھی بہت چیخا چلایا۔ اب زبان ساکت ہو گئی ہے۔

جنّو کو بھی وہی مرض تھا۔ جنّو کی اک بک کا کچھ نہ کچھ جواب مل رہا تھا۔ پٹیاں بدلی جا رہی تھیں۔ ہاتھ پیر دھوئے جا رہے تھے۔ چچی اور ماں کے ہاتھ نہیں رک رہے تھے۔ جتنا دھویا جائے گا، بخار نیچے جائے گا۔ یہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی۔

دوسرے پلنگ کے بچے کی آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔ ماں باپ آنکھ کے پپوٹوں کو کئی بار کھول کر دیکھ چکے تھے۔ گھر والے بار بار ڈاکٹر کو یاد کر رہے تھے۔ کمپاؤنڈر نے تھرمامیٹر سے بخار دیکھا کلوکوز کی رفتار چیک کی اور صرف اتنا کہا ٹھیک ہے اور چلا گیا۔

جنّو کی چچی نے بھی ڈاکٹر کو بلانے کے لیے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔ اس نے جواب دیا میں ڈاکٹر سے بات کر کے آ رہا ہوں۔ جو دوائیں لکھی تھیں، وہ لا دیں۔ اب اور ایک انجکشن لکھا ہے، اسے شہر سے ڈھونڈ کر لانا ہے۔

"تمہاری بھابی نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ جنّو کی چچی سے اس کے باپ نے کہا۔

ہم لوگ بھی صبح سے جنو کے بارے میں پریشان تھے اس لیے کچھ کھا پی نہ سکے۔ بھیّا ہوٹل سے کچھ لے لو۔

تبھی بغل کے بچے کے لیے ایک مشین لائی گئی۔ پلاسٹک کی ایک نلی ڈال کر گلا صاف کیا گیا۔ بہت سا بلغم اس بچے کے گلے سے نکلا۔ سانس کی نلی صاف ہو گئی۔ سانس تیز چلنے لگی، اس کی آنکھیں اب بھی مندی تھیں۔ بچے کو دیکھنے کے لیے کمرہ میں عورتیں بھری تھیں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ ایک خالی پلنگ بھی بار بار چرمرا رہا تھا۔ ان میں سے کچھ عورتیں جنّو کی

طرف متوجہ ہوئیں۔ وہ چنّو کو دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہوگئیں۔ اس بچّے کو دیکھنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ گویا خاندان کے لوگوں کو خطرے کو احساس ہوگیا تھا۔

کھانا آگیا۔ چنّو کے بڑے ابّو نے ناشتہ دان لاکر دیا۔ کسی صورت پڑوس سے پکوا کر لایا ہوں۔ شام کا انتظام الگ سے کرنا ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ چنّو پر جھکے۔ چنّو کی آواز آہستہ آہستہ دھیمی پڑتی جارہی تھی۔ بخار ایک ڈگری ضرور کم ہوا تھا مگر سینے کی کھڑکھڑاہٹ میں اضافہ ہوگیا تھا۔

کمرہ میں جگہ نہ تھی۔ وہ کھڑے کھڑے ادھر ادھر جھانکتا رہا۔ چنّو کے بیڈ پر جگہ بنا کر بیٹھ گیا چنّو کے باپ کو دوا کے لیے بھیج چکا تھا۔ بغل والے بچّے کے بارے میں نرسنگ ہوم کے عملہ کی تشویش بڑھتی جارہی تھی۔ جس کا اثر چنّو کے تیمارداروں پر بھی پڑ رہا تھا۔ انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ یہی مرض چنّو کو بھی ہے۔

"بھیّا! آپا کے یہاں کہلوا دیا؟" چنّو کی چچا نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ ابھی اطلاع نہیں دے سکا۔ اس کی دوا داروں میں ہی پھنسا رہا۔ کسی جان پہچان والے کی تلاش میں ہوں سڑک پر بھی کھڑا رہا۔ کوئی جان پہچان والا نہیں ملا۔ البتہ اس کے ماموں موٹر سائیکل سے مجھے دیکھتے ہوئے گزر گئے۔

"بھیّا، آپ کو دیکھ کر نہیں رکے، چنّو کی ماں نے تشویش کا اظہار کیا۔

"پڑوس میں بھی بتا دیجئے گا"، چنّو کی چچی نے کہا۔

پڑوس میں اطلاع ہوگئی ہے۔ چنّو کے بڑے ابّا نے کہا۔

اب دیکھو اللہ کی مرضی کیا ہے؟ ہم لوگ تو چنّو کا گھر پر انتظار کر رہے تھے۔ صرف بخار اور سینے کی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ ایسا تو برابر ہوتا رہتا تھا۔

مرض کیا رنگ لائے کون بتا سکتا ہے۔ چنّو کے بڑے ابّا نے تشویش کا اظہار کیا۔

"بھیّا، ہمارے میکے کہلوا دیجئے"، چنّو کی ماں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

کیا فائدہ۔۔۔؟ کوئی آئے تب تو، چنّو کا ماموں سامنے سے موٹر سائیکل پر دندناتا

گزر گیا۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا، جیسے اس سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ بڑے باپ نے جواب دیا۔

انھیں پتہ نہ ہوگا۔ چنّو کی ماں نے کہا۔

اس بھیڑ کو دیکھتی ہو۔ اس نے دوسرے بیڈ کے گرد جمع بھیڑ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ان لوگوں کو کوئی بلانے گیا تھا۔ یہ لوگ اپنا عزیز رشتہ دار سمجھ کر آ گئے، بڑے باپ نے جواب دیا۔

"جب ان لوگوں نے رشتہ ہی توڑ رکھا ہے تو کیا کیا جائے"، چنّو کی چچی بولی۔

اماں ابّا کو پتہ چل جائے وہ آ جائیں گے۔ چنّو کی ماں نے کہا۔

شادی کے بعد آج تک کتنی بار آئے۔ میرے باپ بُری طرح بیمار پڑے۔ یہی لڑکا نہ جانے کتنی بار بیمار پڑ چکا ہے۔ کوئی دیکھنے آیا؟ بڑے باپ نے چنّو کی ماں سے بہت سے سوالات کر ڈالے۔ تبھی بغل کے بیڈ پر عورتیں چیخنے لگیں۔ ایک کہرام مچ گیا۔ چنّو کی ماں اور چچی چنّو کے بیڈ سے کھڑی ہو کر دوسرے بیڈ کو دیکھنے لگیں۔ عورتیں اور مرد سب زار و قطار رو رہے تھے۔ گلوکوز ہٹا دیا گیا تھا۔ بلغم نکالنے والی مشین کنارے کر دی گئی۔ بچّے کا اسٹریچر کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔

چنّو کی ماں نے چنّو کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کی پسلیاں پھڑک رہی تھیں، دل کی دھڑکنیں تیز تھیں، چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ دوسرے بچّے کی ماں فرش پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ تیمار دار مرد اور عورتیں بے حال اور آزردہ اسے سنبھالنے میں لگے تھے۔ باپ آنسو بہاتا عزیزوں کے نرغے میں کھڑا تھا۔ آنسوؤں کے آگے دلاسہ دینے والے الفاظ بے اثر ہو گئے تھے۔ یہ سب دیکھ کر چنّو کے تیمار دار تھوڑی دیر کے لیے اپنی مصیبت بھول گئے۔

بھیڑ اچانک رونے والوں کو لے کر کمرے سے نکل گئی، کمرہ اچانک سونا ہو گیا۔ چنو کے تیمار داروں کا غم اچانک اُبھر آیا۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو کے قطرے بہہ چلے۔ بلغم کی کھڑکھڑاہٹ بار بار نرخرے کو پکڑ رہی تھی اور چنّو کے تنفس میں دقت پیدا کر رہی تھی۔

تیمار داروں کے لیے آج کی رات بھاری تھی۔ خاندان میں جن جن کو اطلاع ملی تھی۔ وہ چنّو کی خیریت پوچھ کر دن میں جا چکے تھے۔ ڈاکٹر آخری راونڈ میں کئی ڈاکٹروں کے ساتھ آیا۔ جس میں اس کا استاد بھی شامل تھا۔ شاگرد نے استاد سے نسخہ چیک کرایا۔ وہ بولا۔

سب دوائیں دیدیں۔ اب کچھ بچا نہیں ہے۔ سینئر ڈاکٹر کی یہ تسلی چنّو کے بڑے باپ کے لیے کافی تھی۔ اللہ مالک ہے۔ اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ہاں زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے"، سینئر ڈاکٹر نے ہاتھ اوپر اٹھا کر گویا سب کو مخاطب کیا۔

"کب یہ رشتہ ٹوٹ جائے کوئی بتا نہیں سکتا"، چنّو کے بڑے باپ نے ڈاکٹر کے جملے کی تعبیر پیش کر دی۔

چنّو کا بخار ایک سو چھ تک پہنچا۔ اس وقت تک رات کا ایک بج رہا تھا، تنفس بہت تیز تھا لیکن بلغم کی کثرت سانس لینے میں رکاوٹ ڈال رہی تھی۔ اس کے منہ کے کناروں پر بار بار جھاگ جمع ہو رہا تھا۔ برف کی پٹیوں کا کوئی اثر نہ تھا چنّو کی آنکھیں بند تھیں۔ گردن اکڑ گئی تھی۔ جسم کا تناؤ سخت ہوتا جا رہا تھا گلوکوز کی بارہویں بوتل ختم ہونے کے قریب تھی کہ چنّو کی ماں ہڑبڑا کر سیدھی بیٹھ گئی۔

بھابھی! کیا ہے ....؟ نند نے پوچھا۔

"میں اپنے میکے والوں کو بلانے جا رہی ہوں"۔ چنّو کی ماں نے اتنا کہا ہی تھا کہ یکلخت چنّو کی سانس رک گئی۔ گردن ایک طرف لڑھک گئی، عورتیں چیخ اٹھیں، مرد دوڑ پڑے نرسنگ ہوم میں کہرام مچ گیا۔ سوئے ہوئے لوگ بھی بھاگ کر آ گئے اس وارڈ سے اٹھنے والی چیخ پکار نے سوئے ہوئے مریضوں کو بھی جگا دیا تھا۔

کمپاؤنڈر دوڑ پڑے۔ ڈاکٹر کو فون کیا گیا، کمپاؤنڈروں نے جلدی جلدی بلغم صاف کرنے کی مشین چلا دی، ایک کمپاؤنڈر پیروں سے مشین کی پمپنگ کر رہا تھا۔ دوسرا نلی منہ میں ڈال کر بلغم نکالتا رہا لیکن سب بے سود تھا۔ زندگی کی مشین بند ہو چکی تھی۔ چنّو کا رشتہ دنیا

سے ٹوٹ چکا تھا۔

چنّو کی میّت گھر پہنچائی گئی۔ چنّو کی ماں اور جچی ہوش کھو چکی تھیں۔ باپ بے سدھ پڑا تھا۔ لاشہ پر آنسو بہانے کے لیے عزیز و اقربا جمع ہو رہے تھے۔ چنّو کا ننھیالی خاندان بھی روتا دھوتا آپہنچا۔ نانا، نانی، ماموں اور خالاؤں نے چنّو کی ماں کو گھیر لیا۔

"بیٹی!" یہ کہہ کر چنّو کی نانی نے چنّو کی ماں کو لپٹایا چنّو کی ماں نے آنکھیں کھولیں۔

"اماں! بڑی دیر میں خبر لی۔ میرا لعل چھوڑ کر چلا گیا" چنو کی ماں نے مری ہوئی آواز میں اپنی ماں سے شکوہ کیا۔

"ہاں بیٹی!" صبر کرو۔ اب ہم لوگ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ چنّو کی نانی نے دلاسہ دیا۔

چنّو کی ماں کے دانت لگ گئے ننھیال کے لوگ چیخ اٹھے۔

"کسی ڈاکٹر کو بلاؤ"

مرد دوڑ پڑے۔ عورتیں چنّو کی ماں کے گرد سمٹ گئیں۔ زندگی کے پرانے رشتے پھر سے استوار کیے جانے لگے۔

حسین امین

(پہلی قسط)

# مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت

# کاروانِ زندگی کی روشنی میں

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا "کاروان زندگی" اپنی چھ منزلیں طے کرنے کے بعد اب ساتویں منزل کے تقریباً نصف راستے تک پہنچ چکا ہے اور عنقریب منزل پر پہنچ کر روشنی کا ایک نیا منارہ قائم کرے گا۔

"کاروان زندگی" کی ساتویں جلد کی تازہ ترین پوزیشن کے بارے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی حالیہ علالت سے چند روز قبل راقم الحروف کو بتایا تھا کہ اس وقت "بنگلور" کا باب لکھا جا رہا ہے، یعنی رابطہ ادب اسلامی عالمی کے سولہویں علمی مذاکرہ کی روداد جو ادب اسلامی میں قصہ نگاری کے موضوع پر دارالعلوم سبیل الرشاد کے مہتمم اور امیر شریعت کرناٹک مولانا مفتی اشرف علی باقوی اور مولانا سید شاہ مصطفےٰ رفاعی قادری اور دیگر ممتاز اہل شہر بشمول ایڈیٹر انچیف روزنامہ وہفت روزہ سالار، بنگلور میر مقصود علی خاں سابق ایم۔پی کی میزبانی میں ہوا تھا۔ اس مذاکرۂ علمی میں جس میں حضرت مولانا نے شرکت فرمائی تھی نہ صرف ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی علمی شخصیات نے شرکت کی تھی بلکہ ملیشیا، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے نمائندوں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس مذاکرہ کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جنوبی ہند کے متعدد

مقامات کا سفر بھی کیا تھا۔ وہ منگلور میں ممتاز طبیب ڈاکٹر حبیب رحمٰن کے میڈیکل سنٹر بھی تشریف لے گئے جہاں ان کا چیک اپ ہوا تھا اور بھٹکل بھی گئے تھے۔ بنگلور کے سفر سے واپسی پر حضرت مولانا علیل ہو گئے جس کی وجہ سے کاروانِ زندگی کی ساتویں جلد کی تصنیف کے کام پر بھی اثر پڑا۔ اب جب کہ حضرت مولانا پہلے سے بہت بہتر ہیں جن کی عیادت کے لیے خادم الحرمین شریفین ملک فہد بن عبدالعزیز کے سفیر برائے ہند ہز ایکسلنسی عبدالرحمٰن بن ناصر العوہلی اور دینی امور کے اتاشی الدکتور ولید الخمیس سمیت عالم اسلامی کی ممتاز شخصیات، امریکہ، یورپ، پاکستان، بنگلہ دیش اور مشرق بعید کے ممالک کی اہم شخصیات کا تانتا بندھا ہوا ہے، توقع ہے کہ کاروانِ زندگی کی ساتویں جلد کے منظر عام پر آنے میں زیادہ تاخیر نہیں ہونے پائے گی۔

"کاروانِ زندگی" کے عنوان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی خود نوشت سوانح لکھنے کا سلسلہ اگست ۱۹۸۳ء سے شروع کیا تھا۔ ۳۷۹ صفحات پر مشتمل چھٹی جلد کا جو ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء تک کے حالات اور واقعات پر محیط ہے مصنّف نے اس کا پیش لفظ مورخہ ۱۴ر فروری ۱۹۹۶ء کے بعد آغاز دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے نئے مہتمم کے انتخاب کی کارروائی کے ذکر سے کیا، جس میں ندوہ کے شعبہ عربی ادب کے صدر ایک باصلاحیت منتظم کار، صف اوّل کے مصنّف اور متعدد بین اقوامی اداروں بشمول اسلامی مطالعاتی مرکز آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے عہدوں پر فائز مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو ندوہ کے بزرگ نائب ناظم مولانا معین اللہ ندوی کی پرزور تحریک اور مکّہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور اب ندوہ کے معتمد تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اور نائب معتمد مال پروفیسر محمد وصی صدیقی کی اتنی ہی پرزور تائید پر اس اہم عہدے پر اتفاق رائے سے منتخب کیا گیا۔ اختتام ارض پاک کے سفر سعادت کی تکمیل اور بمبئی واپسی پر ہوتا ہے۔ اس باب کو لکھتے وقت مصنّف نے یہ اشارہ دیا تھا کہ اب اس جلد ششم اور شائد کاروان زندگی کے سلسلے کا اختتام اس سفر شرف وسعادت

پر کیا جاتا ہے جس کے لیے ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو بمبئی سے جدہ روانگی ہوئی۔ بہر حال اب جبکہ ساتویں جلد تیاری کے مرحلے میں ہے کاروانِ زندگی کے قارئین کی یہ مایوسی ختم ہوئی کہ اب مزید یہ سلسلہ جاری نہ رہے گا۔

اب تک مجموعی طور پر ۲ ہزار ۴، ۴ صفحات پر مشتمل کاروان زندگی کے طابع و ناشر مکتبۂ اسلام محمد علی لین گوئن روڈ لکھنؤ ہیں۔ اس عظیم تصنیف کا عربی ترجمہ دنیائے اسلام کے مشہور اور فعال نوجوان عالم دین اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاد مولانا سیّد سلمان حسینی ندوی نے کیا ہے جن کو عربی اور اردو زبان پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ انگریزی ترجمہ حکومت ہند کے بے حد ایمان دار افسروں میں شمار کیے جانے والے سابق انکم ٹیکس افسر لکھنؤ کی حسن منزل نیا گاؤں مشرقی سے تعلّق رکھنے والے جناب شیخ عبداللہ کر رہے ہیں۔

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی جیسی عالم اسلام کی ممتاز اور قدآور شخصیت کی جس کے لیے جید عالم دین قاری محمد طیبؒ صاحب کے بیٹے اور مشہور عالم دین اور دار العلوم دیوبند (وقف) کے مہتمم مولانا سالم قاسمی کا کہنا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی نگاہ ہر معاملے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ہی طرف اٹھتی ہے۔ خود نوشت سوانح رواں صدی کے اواخر میں لکھے جانے والے سوانحی ادب میں نہ صرف ممتاز مقام حاصل کرے گی بلکہ گراں قدر اضافہ کرے گی کیونکہ اس میں پوری صدی کے بالخصوص ان حالات اور واقعات کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ جن کا تعلّق عالم اسلام سے ہے اور ان پر عوامی ردعمل بھی پیش کیا گیا ہے جو تاریخ کی کتابوں میں نہیں ہوتا ہے۔

کسی ایسی ہمہ گیر اور شہرۂ آفاق شخصیت کے قلم سے جب اس کی آپ بیتی ضبط تحریر میں آتی ہے جس کی علمی لیاقت، بصیرت، دیانت، ذہانت، حق گوئی و بے باکی، اعلیٰ ظرفی اور دین داری کا اعتراف ساری دنیا کو ہو اور جس کا شمار عالمی سطح پر صف اول کے اکابرین ،علمائے دین، مصنفین، مؤرخین، مفکرین اسلام، داعیان اسلام اور مصلحین میں ہوتا ہو تو شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کی آپ بیتی میں مختلف نوعیت

کے حالات، واقعات اور حادثات پر اس شخصیت کے احساسات، تأثرات، اور ردعمل بالعموم صرف اس کے اپنے نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ وہ نمائندہ حیثیت کے حامل ہوں گے اور بین الاقوامی سطح پر سوسائٹی کے ایک کراس سکشن یعنی مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والوں کے ایک وسیع حلقے کے ذہن کے ترجمان اور عکاس ہوں گے، کیونکہ ایسی شخصیات کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہوتا ہے اور سماج کے مختلف حلقوں کا احاطہ کرتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو ساری دنیا میں عام طور سے مولانا علی میاں یا صرف علی میاں کے سیدھے سادے نام سے معروف ہیں نہ صرف مذکورہ خصوصیات کے حامل ہیں بلکہ رواں صدی کی تاریخ کے ممتاز ترین، باکمال اور متنوع الکمال شخصیات کی فہرست میں اپنی انفرادیت کے ساتھ شامل ہیں۔ مولانا علی میاں قرآن کی زبان میں بات کرتے ہیں اس لیے حق گو ہیں اور ہر لفظ باوزن اور سچا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے مسلک کے درویش ہیں جو شاہوں کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا بلکہ جس کی چوکھٹ پر خود شاہوں کا ہجوم رہتا ہے جیسا کہ عربی کہاوت ہے "نِعْمَ الأمیر علی باب الفقیر بئس الفقیر علی باب الأمیر" اور اس لیے بے باک ہیں۔ یہی بے باکی مولانا علی میاں کو اپنے ملک اور بیرونی بالخصوص اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو زبانی یا تحریری طور پر ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کراتی ہے۔

## ادب کی صنف

خودنوشت سوانح اپنے آپ میں ادب کی ایک ایسی صنف تسلیم کی جاتی ہے جو تاریخ کے مماثل ہوتی ہے لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ تاریخ میں واقعات اور حالات کا صرف ذکر ہوتا ہے اور خودنوشت سوانح میں ان پر عام تأثرات اور ردعمل بھی قلم بند ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے اس میں وسعتیں اور گہرائی بڑھ جاتی ہے اور وہ بصیرت افروز ہوجاتی ہے۔ اب اگر مصنف کا قلم زوردار ہے اس کی تحریر میں ادب اور

صحافت کی چاشنی بھی ہے اور وہ اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں،، کے مصداق الفاظ سے منظر کشی کر سکتا ہے تو خود نوشت سوانح پڑھنے والا پڑھتے وقت ویڈیو فلم دیکھنے کا مزہ لوٹے گا۔ اسی لیے خود نوشت سوانح نگاری ایک بہت بڑا فن بھی ہے اور ذمہ داری بھی ہے بے شک خود نوشت سوانح میں مصنّف کی شخصیت نمایاں رہتی ہے۔ اور وہ جو واقعات اور حالات بیان کرتا ہے وہ اخباروں اور میگزینوں کے صفحات پر بھی ملتے ہیں لیکن یہ جریدے محفوظ نہیں رہ پاتے اور بعد میں ان کو تلاش اور جمع کرنا ایک مشکل کام بن جاتا ہے۔ چنانچہ کسی دور کے حالات اور واقعات اور ان پر ردعمل جاننے کے لیے اس دور کے کسی مصنّف کی سوانح ایک اچھّے ریفرنس کی کتاب ثابت ہوتی ہے۔

یوں تو کوئی بھی خود نوشت سوانح لکھ سکتا ہے اور جس میں صلاحیت ہو اسے لکھنا بھی چاہیئے لیکن اگر مصنّف ایک قدآور شخصیت کا مالک ہے اور سماجی، سیاسی مذہبی یا علمی حیثیت رکھتا ہے تو اس کی تحریر زیادہ مستند اور معتبر ہوگی۔ یہ اطمینان رہے گا کہ مصنّف کی تحریر میں وہ واقعات جو تاریخ کا حصّہ بنے ہیں وہ بھی صحیح ہیں اور ان پر عوامی یا مختلف حلقوں کے تأثرات اور ردعمل کی صحیح عکاسی بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے ایسی سوانحی تصنیف ریفرنس کی حیثیت رکھتی ہے۔

خود نوشت سوانح اور تاریخ کے فرق کو خود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے یوں بیان کیا ہے کہ زیادہ تر تاریخ کی کتابیں ایک لگے بندھے نظام کے ماتحت واقعات نویسی پر اکتفا کرتی ہیں اور اسی لحاظ سے ان کو "عرفی" و "اصطلاحی" تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان کے مطالعہ سے اس عہد اور ماحول کے لوگوں کے دل کی دھڑکنیں، دماغوں کی خلشیں اور روحوں کے اضطرابات معلوم نہیں کیے جا سکتے۔ ان مسائل و مصائب اور محسوس کیے جانے والے خطرات سے بھی آگاہی نہیں ہو سکتی جنھوں نے اس عہد اور ملک کے باشعور اور صاحب ضمیر طبقہ کی نیند حرام کر رکھی تھی اور اس کو مسلسل اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ نہ اُس کی روئیداد مل سکتی ہے کہ انھوں نے اس صورت حال کا کس طرح

مقابلہ کیا اور اس میں کیا اور کس طرح کی تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ یہ عرفی تاریخیں اپنی فنی اور موضوعی قدر و قیمت کے باوجود اس دور کی ذہنی و فکری، اخلاقی و نفسیاتی اور شعوری و جذباتی عکاسی سے قاصر ہیں۔" مولانا فرماتے ہیں کہ "ان کے مصنفین نے بھی نہ اس کا دعویٰ کیا ہے اور نہ اس کو وہ اپنے فرائض میں سمجھتے تھے کہ ذہنی و فکری جذبات کی عکاسی کریں۔" مولانا علی میاں کے بقول دلوں کی دھڑکنوں، روح کی بے تابیوں اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اختیار کیے جانے والے طریقوں اور جد و جہد وغیرہ کی اور کسی عہد یا ماحول کی اصل تصویر اسی وقت اُبھر کر سامنے آسکتی ہے جب اس وقت کی معتبر تاریخوں کے ساتھ بزرگان دین کے ملفوظات، ان کی مجالس کے موضوع گفتگو، ان کے تأثرات کا مطالعہ کیا جائے۔ اس عہد کے روزنامچوں اور آپ بیتیوں کا مطالعہ کیا جائے، بزرگان دین اور اس زمانہ کے حساس و دردمند اور دلیر اہل فکر اور اہل قلم کے باہمی خط و کتابت اور ان کے مراسلات پر نظر ڈالی جائے۔ حساس اور صادق البیان سیاحوں کے سفرنامے بھی پڑھے جائیں جن میں محض قابل دید مقامات کی سیر و سیاحت اور اپنے اعزاز و استقبال کی روئیداد ہی نہ ہو بلکہ اس شہر ملک، عہد کی تصویر کشی اور وہاں کے رہنے والوں کی ترجمانی بھی ہو۔

## ردعمل کی ترجمانی

مولانا علی میاں کی خودنوشت سوانح سے ان کی اپنی جو شخصیت اُبھرتی ہے اس کے بموجب بھی اور ان کی دیگر تحریروں کا مطالعہ بھی یہ بتاتا ہے اور ان ہی کے قریب رہنے کی سعادت حاصل کرنے والوں کو بھی اس کا پورا علم ہے کہ مولانا نہ صرف ایک بے حد جہاندیدہ انسان ہیں بلکہ وہ ایک بے حد باخبر انسان بھی ہیں۔ خاص طور سے ہندستان بلکہ برصغیر اور اسلامی دنیا کی نبض پر ان کا ہاتھ ہر وقت رہتا ہے۔ اس لیے حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مولانا علی میاں نے اپنی خودنوشت سوانح میں مؤرخانہ ذمہ داریاں اور تصنیفی آداب" کے نبھانے میں کوئی کمی نہیں رکھی ہے۔ لیکن ان میں مختلف

عناصر کو برتنے کے سبب سے سوانح میں متحرک مناظر دیکھنے کا مزہ محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے حقائق اور مغز کی باتوں کو سامنے لانے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کو مانع نہیں بننے دیا ہے۔

مولانا علی میاں نے کاروانِ زندگی میں اپنے حالات سے زیادہ اپنے خیالات کو اہمیت دی ہے جو حالات اور واقعات پر عام احساس اور ردعمل کے ترجمان بھی ہیں۔ مولانا کے بقول تاریخ میں واقعات تو پیش کیے جاتے ہیں لیکن ان پر عام ردعمل نہیں ہوتا ہے جب کہ آپ بیتی میں ایسا نہیں ہوتا۔ مولانا علی میاں کی سرگذشت حیات اسی لیے اور بھی بصیرت افروز ہے وہ کئی اعتبار سے خود بھی اس تاریخ کا حصہ بنے ہیں جس کو قلم بند کیا ہے۔

مولانا علی میاں کے کاروانِ زندگی میں تاریخی واقعات اور ان پر عام ردعمل یا دلوں کی دھڑکنوں کی ایک بہترین مثال ان کے اس خط میں ملتی ہے جو انھوں نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو لکھا تھا اور جس میں ایمرجنسی میں زیادتیوں اور نس بندی کا کوٹا پورا کرنے میں وحشیانہ حرکتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایمرجنسی ایک تاریخی واقعہ تھا اور اس میں پیدا ہونے والے حالات میں "نس بندی" کے سرکاری احکام پر عمل درآمد میں جو وحشیانہ سلوک کیا گیا اس پر عوام کے تاثرات اور دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی مولانا علی میاں نے اسی طرح سے کی مسز اندرا گاندھی کے قتل پر سکھوں کو لوٹنے کے واقعات کے خلاف شریف النفس اور عدم تشدد کے علمبردار حلقوں کے جذبات اور دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی، لوٹنے اور تشدد کے واقعات کے ذمہ داروں کو سخت انتباہ دے کر مولانا نے کی تھی اور مثبت نتیجہ پایا تھا۔

مولانا جلال الدین رومی، جامی، عرفی، غالب، مومن، علامہ شیخ محمد اقبال، الطاف حسین حالی، نظیر، حفیظ جالندھری اور جگر کے ضرب المثل اور برمحل اشعار سے مزین مولانا علی میاں کی سرگذشت حیات بڑی حد تک جگ بیتی سی ہے۔ زندگی انسانیت مذہب، وطن، علم، سیاست، حکومت، تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں انھوں نے اپنے

ایپروچ کا اظہار جن جملوں یا مقولوں سے کیا ہے وہ ایسے ہیں کہ ہر مقولے کو ایک موضوع بنا کر اس پر اخلاقی مضامین لکھ کر ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جا سکتا ہے جو بچّوں کے اندر اخلاقیات اور زندگی کے ایپروچ کے بارے میں بصیرت پیدا کر سکتی ہیں۔ مثلاً ان کا یہ پُریقین جملہ کہ سوویت یونین کے زوال اور امریکا میں اخلاقی انحطاط کے نتیجے میں آج وہ تخت خالی ہے جہاں سے ہندستان دنیا کی اخلاقی قیادت کر سکتا ہے۔ یا یہ کہ "قلم کی قسمت علم سے وابستہ ہے"۔

کاروانِ زندگی کی جلدیں پڑھنے والوں کے لیے انگریزی محاورہ "فوڈ فار تھاٹ" کے مصداق ہیں۔ یعنی خیالات کے لیے غذا فراہم کرتی ہیں۔ کاروانِ زندگی کا مطالعہ ایک ایسی تصنیف کا مطالعہ ہے جس میں ادب کی چاشنی بھی ملتی ہے اور تاریخ کے گلیاروں کی سیر بھی ہوتی ہے، زبان میں روانی اور سلاست تو ہے ہی کیونکہ مولانا علی میاں کو جہاں عربی پر عبور حاصل ہے وہیں فارسی اور اُردو پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں انگریزی زبان بھی بخوبی جانتے ہیں، ساتھ ہی ہر لفظ اور جملہ بصیرت افروز ہے۔ آپ ایسی سرزمینوں ملکوں، شہروں، پہاڑوں، دریاؤں اور عمارتوں کی سیر کرتے ہیں جن کے پس منظر میں قوموں کے عروج و زوال کے مناظر نظر آتے ہیں۔ عظیم شخصیات اُبھرتی نظر آتی ہیں، آپ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز سُنتے ہیں، زبان کی لذّت کا مزہ لیتے ہیں، علم کے سمندروں میں غوطے لگاتے ہیں، کبھی اپنے ملک کبھی دوسرے ملکوں کبھی ساری دنیا کے لیے فکر مند ہو جاتے ہیں، بعض خیالات و نظریات میں آپ کا اعتماد مضبوط ہو جاتا ہے۔ بہت سے سوالوں کا جواب پا جاتے ہیں، بہت کچھ کہنے کا حوصلہ مل جاتا ہے، بہت سی باتوں کے اظہار کے لیے الفاظ پا جاتے ہیں۔ آپ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ ایک ہندستانی، ایک انسان اور ایک مسلمان کی حیثیت سے دنیا میں آپ کا کیا مقام ہے یا ہونا چاہیے۔

## کاروانِ زندگی کی جلدوں کا خلاصہ

کاروانِ زندگی کی پہلی جلد جو ۵۱۸ صفحات پر مشتمل ہے مولانا علی میاں کی زندگی کے ابتدائی دور سے شروع ہوتی ہے۔ خاندان وطن، ماحول، عہد طفلی وغیرہ کے واقعات سے لے کر جس میں لکھنؤ میں قیام کے وہ دلچسپ واقعات شامل ہیں جو بصورت دیگر کم ہی لوگ کبھی جان پاتے۔ جس میں زندگی کے پہلے اور وہ بھی تاریخی سفر، جماعت اسلامی میں شرکت اور علاحدگی، عربی میں دعوتی لٹریچر کی تیاری، صدی کے ان عظیم علمائے کرام سے قربت حاصل کرنے کے شرف کا ذکر ہے جن کا نام لیے بغیر ہندستان میں جدوجہد آزادی اور دینی و علمی خدمات کا تذکرہ مکمّل نہیں ہوسکتا۔ ندوہ کی رکنیت اور معتمدی، سرزمین مصر کا سفر جہاں "اسمعی یا مصر" کہہ کر مصر کو اس طرح خطاب کیا تھا کہ اسے اپنا اصل مقام یاد آجائے۔ یورپ کے پہلے سفر، سعودی عرب کے جلالۃ الملک فیصل بن عبدالعزیز سے ملاقاتوں، ونوبا بھاوے سے ملاقات، مسلم مجلس مشاورت کی دعوت اور اس کے قیام رابطہ عالم اسلامی کے قیام، دمشق، شام، سوڈان، بیت المقدس، کویت، بغداد، کراچی کے سفر کا ذکر ہے۔ ابطال اسلام میں سرفہرست حضرت خالد بن ولیدؓ کے شہر حمص کا بھی ذکر ہے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کا ذکر بھی خصوصیت کا حامل ہے۔ اس جلد کا اختتام فلاڈلفیا (امریکا) میں آنکھ کے آپریشن پر ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں مولانا کو بینائی ملی اور معذوری کا دور ختم ہوا اگرچہ یہ بھی ایک معجزاتی حقیقت ہے کہ مولانا علی میاں کی چودہ برس تک آنکھ سے معذوری کے دوران جس میں ایک خط بھی لکھنا دوبھر تھا ان کی متعدد اہم تصنیفات وجود میں آئیں۔

### جلد دوم

کاروانِ زندگی کی جلد دوم ۳۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا نے ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۳ء تک کے واقعات میں جہاں اپنے وسط ایشیا امریکا کناڈا، پاکستان اور ہندستان

کے مختلف علاقوں کے سفر، دعوتی سرگرمیوں، تصنیفی مصروفیتوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے وہیں تحریک پیام انسانیت، اس کے محرکات اور مقاصد بیان کئے ہیں۔ ہندستان کے ملی اور ملکی مسائل سے دل چسپی اور ان میدان میں جد و جہد کا ذکر ہے۔ اس جلد میں ان کے بعض اہم خطوط کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک انھوں نے ایمرجنسی میں اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو لکھا تھا۔ اس جلد میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام، ندوہ میں ۸۵ ویں جشن تعلیمی کے موقع پر ایک عدیم المثال عالمی اجتماع کا ذکر ہے جس میں شیخ الازہر (مصر) کی جیسی شخصیت بھی شامل تھی۔

مولانا علی میاں نے اس جلد میں ندوہ کی نظامت سے استعفا دینے کی کوشش، اس کی نامنظوری اور ندوہ میں اسٹرائک کا واقعہ لکھا ہے۔ رائے بریلی میں مولانا کی قیام گاہ دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں میں مسز اندرا گاندھی کی آمد، جنتا پارٹی کے چند رہنماؤں سے دلچسپ ملاقات، سعودی حکمرانوں سے ملاقاتوں اور مراسلت، حرم شریف کے ناشدنی واقعہ کا جب مولانا خود وہاں موجود تھے ذکر ہے۔

مولانا علی میاں نے اس جلد میں ملک کے مسلمانوں کو یہ پیغام بھی دیا ہے کہ ایسے دور میں جب حکومتوں کا دائرہ اتنا وسیع اور پوری زندگی پر حاوی ہو اور ایسے ملک میں جہاں حق رائے دہندگی، سیاسی اثر و نفوذ اور دانش مندی کے سوا اپنے تحفظ یا کسی خطرے کو روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا ایک ایسی ملت ملک کی سیاست اور جمہوری طریقے سے اثر انداز ہونے سے کیسے کنارہ کشی اختیار کر سکتی ہے جس کے مذہب کا دائرہ اور تصور پوری زندگی پر محیط ہے۔ اس جلد میں ایک اور بہت اہم پیغام ملتا ہے جو کشمیر کے مسلمانوں سے متعلق ہے اور جس میں ان سے کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے حالات کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی خصوصیات اور اکثریت کے ساتھ باقی رہیں۔ ہندوستان میں تب ہی صحیح توازن قائم ہوگا۔

---

جلد سوم:۔

کاروانِ زندگی حصہ سوم جنوری ۱۹۸۴ء سے نومبر ۱۹۸۷ء تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے جن سے خود مولانا علی میاں کا براہ راست تعلق رہا ہے۔ ۳۶۰ صفحات پر مشتمل اس جلد میں بھی مولانا کے مختلف بیرونی ملکوں کے اہم سفر ہیں۔ اس جلد کا آغاز شرق اردن اور یمن کے سفر سے ہوتا ہے۔ اس جلد میں مسز اندرا گاندھی کے نام ایک تاریخی خط کا ذکر ہے اور ان کے قتل کے بعد سکھوں کے خلاف زبردست ردعمل اور اس بارے میں مولانا کے موقف کا ذکر ہے۔ ہندو احیائیت مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے ملک گیر مہم، بورڈ کے کلکتہ اجلاس، شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے پر تشویش اور اس کے اثر کو زائل کرانے کے لیے متعلقہ ایکٹ میں ترمیم کرانے کی غرض سے مہم، وزیر اعظم راجیو گاندھی کے نام خط، بابری مسجد، میرٹھ کے فساد، رابطہ ادب اسلامی کے قیام انگلستان و بلجیم، ملیشیا، بنگلا دیش پاکستان کے اہم سفر کا ذکر ہے۔ اس جلد میں رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل اور امام حرم کی لکھنؤ آمد کا ذکر ہے۔

جلد سوم میں ہندستان میں بعض افسوسناک حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس پر بھی کہ اگر سچائی ہو تو کامیابی بھی ملتی ہے۔ پوری جلد میں مسلمانوں کے عائلی قانون کے سلسلے میں ایک زبردست جدوجہد پر مرکوز نظر آتی ہے اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قیادت ان کی شخصیت اور ان کی تمام اختلافات سے بلند ایک منفرد حیثیت نمایاں کرتی ہے۔

جلد سوم کا اختتام دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سربراہ سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کی لکھنؤ میں المناک موت اور جامعہ سلفیہ بنارس میں ایک سیمینار کے تذکرے پر ہوتا ہے۔

جلد چہارم:۔

۴۳۹ صفحات پر مشتمل کاروانِ زندگی کی جلد چہارم ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء کے آخر

تک کے حالات کا احاطہ کرتی ہے جس کا آغاز صدر پاکستان ضیاء الحق کے ہوائی حادثے میں سانحہ ارتحال سے ہوتا ہے۔ اختتام ایک انگریزی اخبار میں مولانا سے متعلق غلط بیانی کی تردید اور اس وقت کے وزیر اعظم چندر شیکھر کے نام اپنے خط کے اہم حصّوں کے بیان پر ہوا ہے۔ چوتھی جلد میں ملک اور بیرون ملک میں پیدا ہونے والے چند بہت اہم واقعات کا ذکر ہے اس میں ہندوستان کے اندر فرقہ وارانہ صورت حال، اجودھیا میں شلا نیاس رام جنم بھومی کی تحریک، بھاگلپور کے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر شامل ہے۔ ملک کی فضا کو زہر آلود ہونے سے بچانے کے لیے مولانا کی کوششوں کا ذکر ہے جس میں شنکر آچاریہ سے ان کی ملاقات کا ذکر ہے۔ روس میں انقلاب، پاکستان میں نسلی وعلاقائی فسادات، منیٰ کے سنگین حادثے، بابری مسجد کی تحریک کے سلسلے میں فریقین کے رویے اور اس سلسلے میں مناسب موقف کے بارے میں مولانا کی رائے کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ایران کے عظیم زلزلے پر بھی تأثرات شامل ہیں۔

چوتھی جلد میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحق اور میر واعظ مولوی محمد فاروق کے بہیمانہ قتل کا بھی ذکر ہے۔ مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کی وفات پر مولانا نے اپنے تأثرات لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے سفر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے وفد کی وزیر اعظم سے ملاقات، وزیر اعظم وی۔ پی سنگھ کے استعفے، رابطہ ادب اسلامی، پیام انسانیت، کل ہند دینی تعلیمی کنونشن، پرسنل لا بورڈ کے اجلاس نہم، مولانا عبد الماجد دریابادی پر سیمینار، ترکی، لندن، حجاز، متحدہ عرب امارات وغیرہ کے سفر اور ہندستان کے مختلف شہروں کے سفر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اس جلد میں مولانا علی میاں نے وزیر اعظم وی۔ پی۔ سنگھ سے گفتگو میں ہندوستان کی بقا کے لیے جمہوریت، نامذہبیت اور عدم تشدد کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اسی جلد میں اس آرڈی ننس کا بھی ذکر ہے جس کے تحت اجودھیا میں زمین کو اکوائر کیا گیا تھا اور جس کی پہلے علماء نے تائید کی تھی لیکن تفصیل معلوم ہونے پر

مخالفت کی تھی چنانچہ وہ آرڈیننس واپس لے لیا گیا۔

**جلد پنجم:** ۔کاروانِ زندگی کی پانچویں جلد جو ۳۵۸ صفحات پر مشتمل ہے دسمبر ۱۹۹۰ء سے دسمبر ۱۹۹۳ء تک کے واقعات اور حالات پر محیط ہے۔ اس جلد کے آغاز کا عنوان "ہمارا معاشرہ کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے" اور اختتام کا عنوان "ایک المناک حقیقت اور اس کے ازالہ کے لیے جدوجہد" یہ سمجھ لینے کے لیے کافی ہے کہ تین برس کی مدّت میں کیا حالات آئے ہوں۔ وہ کوہ آتش فشاں، پھٹا اور بابری مسجد کو ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو ڈھا دینے بلکہ پوری طرح سے مسمار کر دینے کی شکل میں پھٹا، ملک کی اکثریت کے ایک طبقے نے جسے بعد میں سپریم کورٹ تک نے شریر اور گنڈا قرار دیا۔ اور کہا کہ اس طبقے کی شناخت تمام ہندوؤں سے نہیں کرنا چاہیئے۔ قانون کو بالائے طاق رکھ کر مسجد کو گرا دیا۔ اس وقت کے بی۔جے۔پی وزیر اعلا کلیان سنگھ قومی یکجہتی فورم اور سپریم کورٹ کو اور ان کے پارلیمانی لیڈر پارلیمنٹ کو یقین دلا چکے تھے کہ "ڈھانچہ" محفوظ رکھا جائے گا، خلیجی جنگ، ملک فہد کے نام خط اور ان کا جواب، راجیو گاندھی کا قتل، زوال اشتراکیت، رابطہ ادب اسلامی، پرسنل لا بورڈ کے جلسے، وزیر اعظم کی حیثیت سے نرسمہا راؤ کی آمد، مسجد اقصیٰ کے جلا وطن امام کی ندوہ آمد، عبید الرحمٰن خاں شیروانی، ضیاء الرحمٰن صاحب انصاری، حکیم عبد القوی دریا بادی، مولانا محب اللہ لاری ندوی سمیت اہم شخصیات کی وفات، بیرونی سفر، شکاگو میں مذاہب کی عالمی کانفرنس میں شرکت، سمرقند بخارا اور تاشقند کا سفر، کل ہند دینی تعلیمی کنونشن، یو۔پی کے انتخابات اور نتائج مختلف سیکولر پارٹیوں کو ایک ہو کر الکشن لڑنے کے لیے کوششوں کا ذکر ہے۔ اس جلد میں بمبئی وغیرہ میں زبردست فرقہ وارانہ فسادات اور بمبئی کے عظیم دھماکوں کا بھی ذکر آگیا ہے۔ بالعموم اس پوری جلد میں ملک کے حالات پر فکر مندی اور بعض اسلامی ملکوں بالخصوص لیبیا، تیونس، الجزائر اور کسی حد تک مصر کے انتظامی، حکمراں اور قانون ساز حلقوں میں اسلامی اقتدار کے لیے جدوجہد کے معاملے میں "حساسیۃ زائدۃ"، (الرجی) پر فکر مندی کا اظہار بھی ہے جو ایک مضمون کی شکل میں ہے۔

**جلد ششم:** مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی خود نوشت سوانح "کاروانِ زندگی" کا چھٹا حصہ جو ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء تک کے حالات اور واقعات کا احاطہ کرتا ہے ۳۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ چھٹی جلد کا آغاز دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اہتمام کے لیے انتخاب کی روداد سے شروع ہوتا ہے جس کے لیے بجا طور پر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی جیسی باوقار اور کڑھی ہوئی شخصیت پر عام اتفاق ہوا، اہتمام جدہ کے مختصر قیام اور وطن واپسی پر ہوا۔

اس جلد میں یوں تو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، دینی تعلیمی کونسل، ندوہ، رابطہ عالمی اسلامی، رابطہ ادب اسلامی عالمی کے سلسلے میں مصروفیات، ملکی اور بیرونی سفر اور بعض اہم افراد کی وفات کا ذکر ہے۔ مسٹر دیوی گوڑا کی وزیر اعظم کی حیثیت سے مولانا سے ملاقات کے لیے ندوہ آمد اور پھر مولانا کا دیوی گوڑا کے نام ایک بے حد اہم خط، وزیر اعظم ترکی کے نام ایک اہم خط کا ذکر ہے، سورت (گجرات) میں طاعون کی وبا اور فیروز آباد میں پرشوتم ایکسپریس اور کالندی ایکسپریس ٹرینوں کے تصادم اور ہلاکتوں کا بھی ذکر ہے جس سے ملک کی اخلاقی کیفیت کی واضح عکاسی ہوتی ہے، لیکن اس جلد میں ایک خاص اور قابل توجہ باب ندوہ پر دہلی پولیس کے ساتھ لکھنؤ پولیس کی مدد سے انٹلی جنس بیورو کے ناکام چھاپے اور اس پر ساری دنیا میں ردعمل کا ہے۔ اور اس واقعہ کا بھی ذکر ہے کہ مولانا علی میاں کو کعبہ شریف کے کلید بردار شیبی خاندان کے ذمہ دار شیبی نے کلید کعبہ پیش کی تاکہ وہ ان ممتاز شخصیات کو لے کر کعبہ شریف کی عمارت میں داخل ہوں جو رابطہ عالم اسلامی کی عالمی مساجد سے متعلق ذیلی کمیٹی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے اور ملک فہد نے ان کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دی تھی۔

یہ بھی عجب واقعات تھے اور کاروان زندگی کا مطالعہ کرنے والے ان واقعات کو شاید اس نظر سے دیکھیں کہ ہندستان کے پاس دنیائے اسلام کی سربرآوردہ شخصیت تھی جس کی قدر نہیں کی گئی اور اس کی سربراہی میں چلنے والے ادارے کو محض خیال خام کی بنا پر شک کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ ادارہ جس کی وجہ سے ہندستان کا نام روشن ہے اور دوسری طرف

اس ادارے کے سربراہ کو کلید کعبہ پیش کر کے وہ اعزاز بخشا جاتا ہے جو شاہوں کو نہ ملا ہوگا۔

دیوی گوڑا کے نام مولانا علی میاں نے جو خط لکھا ہے اس میں انھوں نے خلوص اور صداقت کو تمام مشکلات پر فتح کی کنجی قرار دیا ہے اور جنگ آزادی کے رہنماؤں اور ملک کے بعید النظر اور عمیق النظر قائدین مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو کے اصولوں جمہوریت، نا مذہبیت (سیکولرازم) اور عدم تشدد کو ملک کی سالمیت، حفاظت اور ترقی کے لیے شرط بتایا ہے جو صحیح معنوں میں دل کی دھڑکنوں کی ترجمان ہے۔

## باکمال شخصیت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی خود نوشت سوانح کاروانِ زندگی کا مطالعہ کرتے وقت کئی دلچسپ اور اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو خود مولانا علی میاں صاحب کی اپنی شخصیت، کسی بھی خود نوشت سوانح میں سوانح نگار کی شخصیت قاری کی توجہ کا خاص مرکز بنتی ہے۔ ہر قاری اس شخصیت کو اپنے لحاظ سے "دریافت" کرتا ہے۔ اس کے اپنے اپنے زاویے ہوتے ہیں۔ مولانا علی میاں کی جو شخصیت ان کی "آپ بیتی" سے ابھرتی ہے تقریر و تحریر پر یکساں قدرت رکھنے والے ایک ایسے باکمال اور متنوع الکمال عالم باعمل کی شخصیت ہے جو فقط "اللہ ہو، اللہ ہو" تک محدود نہیں ہے بلکہ حرکت میں برکت اور خدمت سے عظمت پر یقین رکھتی ہے جس نے علماء کے بارے میں اس تصور کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے کہ علماء کا دائرہ صرف مسجد اور مذہبی امور تک محدود ہو، بلکہ اس کے برعکس عمل سے ثابت کیا ہے کہ علماء کسی بھی ایسے معاملے میں خاموش نہیں رہ سکتے جو اسلام، انسانیت، اخلاق اور شرافت کے خلاف ہو چنانچہ جس نے اپنی داعیانہ اور مصلحانہ سرگرمیوں میں نئی وسعتیں پیدا کیں، جو اس لحاظ سے سرگرم رہتی ہو کہ "قلم کی قسمت علم سے وابستہ ہے اور مسلمان سے تقدیر انسانی وابستہ ہے جو مردہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی" کے مصداق عملاً سال کے ۳۶۵ دن

سفر میں رہتی ہو، جس کا مقصد حصول علم، فروغ علم اور دعوت ہو نیز ملّت کے تانے بانے کو مضبوط کرنا ہو اور "تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدن" کے ارشاد الٰہی کی روشنی میں انسانی رشتوں کو جوڑنا اور مضبوط کرنا ہو، جس نے ایسے اکابر علمائے دین اور علمی شخصیات سے تعلیم و تربیت، صحبت اور قربت نیز ملاقات کی سعادت حاصل کی ہو جن کا نام لیے بغیر ہندستان کی ملّت اسلامیہ بلکہ پورے عالم اسلام کی ملّت اسلامیہ کی رواں صدی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی، لیکن جس نے بہر حال اپنی ایک پہچان الگ ہی بنائی، مولانا علی میاں کی شخصیت میں ایک ایسا داعی چھپا ہوا ملتا ہے جو "معنوی و فکری نہر سوینز" کھودنے کی دعوت دیتا ہے۔ ایک ایسا عالم جس کے بارے میں اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" اس لیے مولانا علی میاں کو دیکھنے، ملنے، ان کو سننے اور ان سے تعلق رکھنے والے نے گویا عالم اسلام کی عظیم ہستیوں کے "نچوڑ" سے تعلق کا شرف حاصل کیا۔ مولانا علی میاں عالم اسلام کے واحد صوفی بزرگ اور عالم دین ہیں جن سے ملاقات کے لیے سربراہان مملکت نے اشتیاق ظاہر کیا ہے، مملکت سعودی عربیہ کے ملک فیصل نے جن سے ملاقات کے لیے اپنا ایک سفر کئی گھنٹے تک ملتوی رکھا، جنرل ضیاء الحق مرحوم اسلام آباد سے کراچی صرف مولانا علی میاں سے ملنے پہنچے۔ مولانا علی میاں کے سامنے دنیا کا کوئی بھی اور کسی مسلک کا عالم زبان نہیں کھولتا۔ وہ کامل شیخ طریقت بھی ہیں، چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقش بندیہ، چاروں سلسلوں میں ان کو اجازت بیعت ہے۔ (جاری)

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی
صدر شعبۂ اردو، انجمن کالج بھٹکل (کرناٹک)

# مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نثر نگاری

## (تاریخ و تذکرہ کے تناظر میں)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے ممتاز اسلوب بیان اور منفرد طرز تحریر کے اعتبار سے جدید اردو نثر کے اہم معماروں میں ہیں۔ آپ نے تقاریر اور خطبات کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کی کوششیں کیں اور مختلف موضوعات پر مستقل تصانیف بھی قلمبند کی ہیں۔ دراصل مولانا اس صدی کے عظیم مفکر اور جیّد عالم ہیں۔ انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، دینی و تہذیبی، تاریخی و اجتماعی اور سماجی و ثقافتی۔ غرض یہ کہ زندگی کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ایسا ہو جس پر آپ نے قلم نہ اٹھایا ہو، مگر مناسب یہ ہے کہ مولانا محترم کی نثر نگاری کے تفصیلی مطالعہ سے قبل خود اردو نثر کی روایت اور اس کے آغاز و ارتقاء کا ایک مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ اس پس منظر میں آپ کی طرز نگارش کا صحیح طور پر تجزیہ ہو سکے اور آپ کے اسلوب بیان کے فنّی محاسن کو سمجھنے میں ہمیں آسانی ہو۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اردو نثر کا آغاز تبلیغ اسلام اور فروغ دین کے تحت ہوا ہے، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی کتاب "معراج العاشقین" جسے اردو نثر کی ابتدا سے منسوب کیا جاتا ہے، تبلیغ دین سے متعلق ہے۔ بعد کے دور کی نثر میں بھی اسی نوعیت کے نمونے ملتے ہیں، مثلاً صوفیائے کرام کے ملفوظات، اسلامی موضوعات

پر تصنیفات اور اسی تسلسل میں اردو تفاسیر وغیرہ آتی ہیں۔ شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی کی وہ مجلس یا کربل کتھا ہے، جو عام فہم اور قدیم ادبی تحریر کا نمونہ ہے۔ اسی طرح حضرت شاہ رفیع الدین اور حضرت شاہ عبدالقادر بھی ترجمہ و تفسیر قرآن مجید میں اسلوب قدما کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر حضرت شاہ ولی اللہ کا فکری انقلاب رنگ لایا اور اس نے اسی خانوادے کے ایک بزرگ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی صورت میں اپنا عملی ظہور کیا، اردو میں آپ کی ایک یادگار کتاب "تقویۃ الایمان" ہے، جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بقول مولانا غلام رسول مہر "آج تک یہ چالیس پچاس لاکھ کی تعداد میں نہ چھپی ہوگی" اور پروفیسر آسی ضیائی کے مطابق اس کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ جدید اردو نثر کی داغ بیل صحیح معنوں میں اسی کتاب کے ذریعہ پڑی۔۔۔۔ اس اعتبار سے بھی یہ کتاب نہ صرف اردو ادب کی پہلی کتاب ہے بلکہ اس کے بعد بھی دور سرسیدؒ تک ہمیں کوئی ایسی تصنیف نہیں ملتی جس پر موافق و مخالف ہنگامہ آرائی ہوئی ہو، بلکہ اس کا سلسلہ بعد کی صدی تک بھی جاری رہا ہو، اس کے ذریعہ مصنف نے اردو کے ادیب کو اپنا مافی الضمیر وضاحت کے ساتھ کہنا سکھایا۔"

جدید اردو نثر کے بانی سرسیدؒ اور ان کے رفقاء ہیں۔ انیسویں صدی میں اردو نثر کی معیاری اور اعلیٰ ترین کتاب سرسیدؒ کی "خطبات احمدیہ" ہے، جو اسلام اور رسول اکرمؐ کے خلاف مغربی مفکرین اور مستشرقین کے کذب و افترا کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلے علامہ شبلی نعمانی آتے ہیں، شبلی کی متنوع شخصیات کا نمایاں عنصر تحقیق و تنقید اور تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کی تذکرہ نگاری ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی جدید تنقید اور جدید شاعری ہی کے نہیں بلکہ اردو سوانح نگاری کے معمار اوّل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اردو ناول نویسی کی ابتدا کی تو مولانا محمد حسین آزاد نے تذکرہ نگاری کے فن میں اپنے خلاق ذہن سے نئے انداز اپنائے۔ اردو نثر کے یہ وہ کواکب خمسہ ہیں جنھوں نے اپنی طرز نگارش سے تذکروں کو سوانحی خاکوں، پھر شخصی مرقعوں میں ڈھالنے کی دانستہ

کوششیں کیں اور تاریخ نویسی کے اکتا دینے والے انداز بیان سے ہٹ کر ان میں لفظی رنگ وروغن بھرا۔ تذکرہ نویسی کو بجائے اصطلاحی معنی کے لغوی معنوں میں پیش کرنے کا سہرا مولانا ابوالکلام آزاد کے سر باندھا جا سکتا ہے، انھوں نے تذکرہ میں اس جدّت کو روا رکھا، بعد میں یہی تذکرہ کے قبل کی تحریریں خاکہ اور مرقع سے موسوم ہوئیں۔ مولوی عبدالحق مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی بعض کتابیں اسی نوعیت کی ہیں اور اردو کے سوانحی ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ اردو نثر نگاری کے اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں، جن کی تمام تصانیف خصوصاً تاریخ دعوت وعزیمت کی پانچ جلدیں، سیرت سید احمد شہید کی دو جلدیں، پرانے چراغ کی تین جلدیں اور سوانح شیخ الحدیث مولانا زکریا اور تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری کی اس قدیم روایت کو آگے بڑھانے اور ایک سمت ورفتار عطا کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی نثر کو بنانے سنوارنے اور بے پناہ اثر انگیزی پیدا کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی بلکہ یہ نثر باطن کے کسی سوتے سے بے اختیار پھوٹی اور صفحۂ قرطاس پر نقش ہو گئی ہے۔

مولانا کی نگارشات کا مطالعہ متنوع سمتوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ انھوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں کا دامن ادب وانشار کے گلدستوں سے مالامال کیا ہے۔ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر"، ان کی ابتدائی دور کی ایک ایسی کتاب ہے جو پہلے عربی میں لکھی گئی اور پھر دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے تراجم بڑی تعداد میں شائع ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں مسلمانوں کی تاریخ کا اس سے بہتر تجزیاتی اور معروضی مطالعہ اب تک نہیں کیا جا سکا، اس کتاب نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب نے مقبولیت کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی نے اپنے ایک مقالہ میں مولانا کی بیشتر تصانیف کا تذکرہ بڑے تخلیقی انداز میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"مولانا کی تحریر و تقریر میں ادب کی جلالت اور آبشار کی روانی پائی جاتی ہے، جا بجا انشاء پردازی کے موتی چمکتے اور جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن انشاء کی گل کاریاں بذاتِ خود ان کے یہاں مقصود نہیں، چونکہ وہ داعی اور مصلح اور مجدّد بھی ہیں، اس لیے ادب کو انھوں نے صرف ذریعہ اور وسیلہ بنایا ہے۔ ان کی شخصیت کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ "کاروانِ زندگی، ان کی دعوت و عزیمت" کا جلی عنوان ہے، ان کی شمع کی جلوہ فگنی "پرانے چراغوں" کی ضیا پاشیوں کا مجموعہ ہے، ان کی حیات شش جہات میں "ارکان اربعہ" کی اقامت کا پیغام ہے، ان کی صحبت "صحبت با اہلِ دل" ہے۔ اسلام اور مغربیت کی کشمکش" میں وہ سپہ سالار اور تنہا لشکر جرار ہیں۔ ان کے اخلاق میں "نبی رحمت" کے اخلاق کا پرتو ہے اور عالمی مقبولیت کے باوجود ان کی فقیرانہ اور زاہدانہ زندگی میں "سیرت المرتضیٰ" کا عکس ہے۔"

مولانا کی تصنیفات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ تاریخ و تذکرہ ان کے مطالعہ کا خصوصی موضوع ہے اور ادب و انشاء ان تاریخی حقائق، واقعات اور شخصیات کو پیش کرنے کا مؤثر وسیلہ ہے، یہ تمام تصانیف، ان کے مدلل، مضبوط اور شفاف طرز تحریر کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں اور جہاں تاریخ و ادب ایک دوسرے سے ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی، مولانا حکیم سید عبدالحی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے دین و ادب کا جو چراغ جلایا تھا، مولانا علی میاں ندوی نے اسی سے کسب نور کیا اور تخلیق و تصنیف کی شمع فروزاں کیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے ادب کا وہ اسلوب اختیار کیا ہے، جسے پڑھ کر عوام و خواص سبھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ادبی خوبیاں اور فکری لطافتیں بھری ہوئی ہیں، اُن کی زبان عصر حاضر کی بے تکلّف رواں اور شگفتہ زبان ہے، مولانا کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینی موضوعات پر بھی افسانوی زبان میں خامہ فرسائی کی جا سکتی ہے اور پھر یہ کہ دینی تحریر بھی ادبی دل چسپی رکھ سکتی ہے۔ مولانا کے اسلوب بیان میں سنجیدگی، متانت، اعتماد اور ٹھہراؤ تو ہے ہی مگر

اس کے ساتھ کبھی کبھی شعلے کی سی لپک اور طوفان کا سا دبدبہ بھی محسوس ہوتا ہے، دراصل زیر تذکرہ شخصیات کی داخلی خوبیوں اور ان کے اصلاحی و تجدیدی اور انقلابی کارناموں کے باعث ان کے قلم میں ولولہ و ابتہاج کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔

ان کے اس اسلوب تحریر کا بہترین نمونہ ان کی اوّلین تصنیف "سیرت سیّد احمد شہیدؒ" ہے، اس کتاب کے مندرجات کو سیرت و کردار کی تعمیر اور ایمان و یقین کے جذبات اور کیفیات پیدا کرنے کے لیے بنیاد بنایا جا سکتا ہے، مصنّف نے مؤثر اور دلنشیں واقعات کا ایسا مجموعہ پیش کیا ہے، جو ایمان میں حرکت، قلب میں حرارت اور آنکھوں میں جلتے ہوئے آنسو پیدا کرتا ہے۔ مصنّف نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب سے کسی اور کو کوئی فیض پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو، اس نے خود انھیں حلاوتِ ایمانی سے لذّت یاب کیا، اس نے اہل یقین اور ارباب عزیمت سے متعارف کیا۔ جن کی نظیر اسلام کی پچھلی صدی میں آسانی سے نہیں مل سکتی۔

مولانا کے اسلوب نثر کی کشش انگیز توانائی خود ان کی اپنی شخصیت کی مرہون منّت ہے۔ مشہور جرمن شاعر اور دانشور گوئٹے کا خیال ہے کہ عام طور پر ایک ادیب کا اسلوب اس کے شعور کی ایماندارانہ نقل کے مترادف ہے، تخلیق کے لیے اگر سلیس طرز ادا اپنانا ہے تو پہلے ذہن کو روشن کرنا ہوگا اور اگر شاندار طرز اختیار کرنا ہے تو اپنے کردار کو شاندار بنانا ہوگا یعنی منفرد اسلوب تحریر کے لیے شخصیت سے اس کی گہری وابستگی ضروری ہے، ادیب کی شخصیت اپنے مزاج و میلان کے پس منظر میں فطری تقاضے کے تحت ایسا اسلوب اظہار اختراع کرتی ہے کہ اس کے شخصی اوصاف خود بخود نمایاں نظر آتے ہیں۔ مولانا موصوف کے مزاج کی سادگی اور لینت، طبیعت کی نرمی اور شرافت، رواداری، خوش اخلاقی اور بے پناہ وضع داری جیسی اعلیٰ اخلاقی صفات سے ان کا فکر و فن مرکب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کی شخصیت بڑی متنوع اور ہمہ گیر ہے، جنھوں نے اپنے اندر گلشنِ دین و ادب کے بہت سارے پھولوں کا عطر کشید کر لیا ہے، اور اب ان کی شخصیت ان کے اسلوب کی طرح ایک

ایسا عطر مجموعہ ہے، جس میں مدرسہ وخانقاہ کی طمانیت اور سکون بھی ہے، علم وادب کی جاذبیت اور حسن بھی اور ساتھ ہی ساتھ تحریک واجتماعیت کی حرارت اور سرگرمی بھی۔ یہی جامعیت کا کمال ان کی شخصیت کا خاص امتیاز ہے، اور ان کی تمام تصنیفات، ان کی ہشت پہل ہیرے کی سی شخصیت کا اظہار ہیں، گویا اقبال کی زبان میں ؎

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

ایک اقتباس بطور خاص ملاحظہ فرمائیے، جہاں تاریخ وادب ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں:۔

"ہندوستان میں اسلامی عقائد اور تعلیمات کے فیض، تصوّف کے پیدا کیے ہوئے درد و محبّت اور وسعت نظر، ہندوستان کے خمیر کی آشنا پرستی اور وفاشعاری، رنگ وآہنگ سے اثر پذیری، ترکوں کی مہم جوئی و سپہ گری، افغانوں کی شجاعت وشہامت، مغلوں کے ذوق جمال وقوت ارادی، عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں، سب سے مل کر ایک خاص تہذیب اور ایک خاص ثقافت وجود میں آئی، جس کا نمونہ طبقۂ امراء میں عبدالرحیم خان خاناں، شعراء میں امیر خسرو، اہل دل میں خواجہ نظام الدّین اولیاء اور علماء میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نظر آتے ہیں۔ اس تہذیب وثقافت میں شکوہ بھی ہے، تواضع بھی، حلاوت بھی ہے اور رواداری بھی، اس کی قلم رو میں علوم شریعت وحکمت بھی ہے اور نفاست وذوق لطیف بھی، اس کے دل چسپی کے میدان قلعے بھی ہیں اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں اور خانقاہیں بھی۔ تحقیق وتصنیف کے حلقے بھی ہیں اور مشاعرے بھی۔"

ایک دوسرا چھوٹا سا اقتباس دیکھئے، جہاں مولانا موصوف نے ایک اہم دینی دعوت کا تعارف کراتے ہوئے، اپنی بات بڑی خوبصورت زبان میں بیان کی ہے:۔

"تزکیہ نفس اور تربیت انسانی کی تعلیم عملی تھی، جو جہاد کے میدانوں اور

کاروبار کی مشغولیتوں، خانگی زندگی کے جھمیلوں اور سفر کی منزلوں میں ہوتی تھی، اس تعلیم کا ذریعہ کتابوں کے جامد نقوش نہ تھے بلکہ چلتے پھرتے نفوس تھے، جن کی صحبت و رفاقت سے ہر موقع اور ہر ضرورت کی عملی تعلیم ملتی، جن کے ساتھ رہ کر دین کے صرف نظریات و وسائل معلوم نہ ہوتے بلکہ اس کا سلیقہ اور ملکہ پیدا ہوتا۔ جس طرح اہلِ زبان میں رہ کر زبان سیکھی جاتی ہے اور مہذّب و شائستہ لوگوں کی صحبت و اختلاط سے تہذیب و شائستگی اور حسنِ معاشرت کی تعلیم حاصل کی جاتی ہے، اسی طرح اہل دین کے ساتھ رہ کر بالکل فطری طریقہ پر دین کی تعلیم و تربیت حاصل کی جاتی تھی، یہ دین کی تعلیم کا ایسا ہی فطری، سہل اور عمومی طریقہ ہے جیسا اہل زبان کی صحبت سے زبان سیکھنے کا۔"

مولانا کے طرز تحریر میں جو یقین کی روشنی اور اعتماد کی قوت ہے، وہ دراصل ان ریاضتوں اور مجاہدوں کے زیر اثر ہے، جو خدا اور بندگانِ خدا دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کارزار حیات میں ہمہ وقت مشغول رہنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ طرز تحریر کی یہ خوبی مولانا کے اسلوب کی وہ انفرادیت ہے، جو انھیں دوسروں سے ممیّز کرتی ہے، کیونکہ دوسرے تو محض "رہنما" ہیں جبکہ مولانا "روح نما" رہنمائی میں جہاں بانی ہوتی ہے اور روح نمائی میں جہاں بینی اور بقول علاّمہ اقبال ؎

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

سوانح و خاکہ ادب کی ایک اہم صنف ہے، جیسا کہ اردو نثر کے ارتقار کے جائزہ میں ابھی ہم نے دیکھا کہ شبلی و حالی سے حال تک سوانحی ادب کا تسلسل قائم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں باضابطہ ضخیم سوانحی تصانیف ہیں تو کہیں ان کی جگہ پر خاکہ نگاری اور مختصر مرقع نگاری نے مقبولیت حاصل کرلی ہے، اس مقبولیت کا

راز ایک مخصوص انسانی نفسیات بھی ہے، دراصل ہم تخیل کے سہارے دنیائے رفتہ کی سیر کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ان بیتے ہوئے کوائف سے لطف اندوز ہوسکیں اور ان تاثرات سے مینارۂ نور تعمیر کرسکیں۔ اس ضمن میں ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہر پُرآشوب دور میں اسلاف کے روشن کارنامے ہی قوموں کی زندگی کو حرارت و توانائی بخشتے ہیں۔ جب مغربی سیاست کی برتری اور مادی تہذیب و تمدّن کے سیلاب نے ہماری مشرقی روایت اور ملّی ثقافت کی ہر علامت کو نشانہ بنانا شروع کیا اور مسلم نوجوان اپنے بزرگوں کے روز وال کارناموں سے دست بردار اور ان کی ہر یاد سے محروم ہونے لگے تو سرسیّد جیسے عظیم مصلح کو بھی آواز لگانی پڑی کہ کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھودے"۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی نے تاریخ و تذکرہ اور سوانحی ادب کے موضوع کو اپنے مطالعہ کا خصوصی عنوان بنایا اور "تاریخ دعوت و عزیمت" کی پانچ ضخیم جلدیں لکھ کر خاص طور سے نوجوانان ملّت کو ماضی کے روشن کارناموں سے روشناس کرایا اور ان سے روشنی اور حرارت حاصل کرکے جادۂ عزیمت پر سرگرم سفر ہوجانے کا ولولہ عطا کیا۔

تاریخ و سوانح کی اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں مصنّف نے عقائد کی عقلی تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور روحانی امور کو مادی صداقت کی طرح بیان نہیں کیا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ دوران مطالعہ یہ تحریریں ہمارے ذہن سے اتری نہیں بلکہ قلب پر نقش ہوجاتی ہیں۔ اس وقت تاریخ دعوت و عزیمت جلد سوم کا بطور خاص تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں تصوّف کی تین اہم شخصیات کی حیات اور دعوتی و تبلیغی خدمات کو صحیح پس منظر، حقیقی ماحول اور اپنی اصل روح کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے مشہور بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا تذکرہ ہے جن کے تابناک کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ حضرت خواجہ معین الدّین چشتیؒ نے محمدؒ غوری کے

حملوں کے درمیان اور اسلامی سلطنت کی عمومیت واستحکام سے پیشتر، ہندوستان کے قلب اور قدیم ہندوستان کے عظیم سیاسی وروحانی مرکز کو اپنے قیام کے لیے انتخاب فرمایا، یہ فیصلہ ان کی اولوالعزمی، عالی ہمتی اور جرأت ایمانی کا ایسا تابناک کارنامہ ہے۔ جس کی مثالیں صرف پیشوایانِ مذاہب اور فاتحین عالم کی تاریخ میں مل سکتی ہیں، ان کے استقلال واخلاص، ان کے توکل واعتماد، ان کے زہد وقربانی اور ان کے درد وسوز سے ہندوستان کے لئے دارالاسلام بننے کا فیصلہ کردیا اور جو سرزمین ہزاروں برس سے صحیح یقین اور صحیح معرفت سے محروم اور توحید کی صدا سے ناآشنا تھی، وہ علماء واولیاء کی سرزمین اور علوم اسلامیہ اور کمالات دینیہ کی محافظ وامین بن گئی۔ اور اس کی فضائیں اذانوں سے اور دشت وجبل اللہ اکبر کی صداؤں اور اس کے شہر ودیار قال اللہ وقال الرسول کے نغموں سے ایسے گونجے کہ صدیوں سے عالم اسلام گوش برآواز ہے، ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے"

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے اخلاق وصفات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا موصوف رقم طراز ہیں:۔

"حضرت خواجہ کی سیرت اور زندگی کا مرکزی نقطہ جو ان کے تمام اخلاق و احوال واعمال کا محور ہے، وہ عشق الٰہی کی نعمت خداداد ہے، جو ان میں ابتدائے حال سے نمایاں تھیں، محبت کی یہ چنگاری، جو ازل سے ان کی فطرت میں ودیعت تھی، شیخ کبیر کی صحبت اور طریقۂ چشتیہ کی نسبت سے شعلۂ جاں سوز بن گئی اور اس نے مدت العمر ان کو اور نصف صدی سے زائد دہلی اور اس کے ماحول کو گرم اور منور رکھا اور اس کی وجہ سے صدیوں تک ہندوستان کی فضا عشق الٰہی کی حرارت سے گرم اور گداز رہی، ان کے تمام حالات واشغال، گفتگو اور

مجالس، اشعار اور ان کے انتخاب، واقعات اور ان کی تمثیل، غرض ہر چیز سے اسی سوز باطن اور اسی حرارت عشق کا اظہار ہوتا ہے۔"

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ کے تذکرے میں ایک جگہ مخدوم جہاں کے فارسی مکتوبات کے علمی و ادبی مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا موصوف نے جہاں اپنی اعلیٰ نثر نگاری کا نمونہ پیش کیا ہے، وہیں ساتھ ہی اپنے نظریۂ ادب کی بھی وضاحت کردی ہے:

"ادب و انشاء کے سلسلہ میں عام مؤرخ و نقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام و بقائے دوام کے لیے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیات، اس کا یقین، دلی جذبہ، نئی حقیقت کے اظہار کے لیے اس کی بے چینی اور بے قراری ہے۔ ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لیے مضطرب و بیقرار ہو۔ جب قدرت کی طرف سے ذوق سلیم بھی عطا ہو، الفاظ و اسالیب بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی حاصل ہو اور اس کی تحریر میں علم و ادب، عقل و استدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہو تو اس کی تحریر میں ایسا اثر اور ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گذر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی و زندگی اور اس کی تاثیر و قوت تسخیر قائم رہتی ہے۔"

مولانا علی میاں ندوی ایک ادیب، ایک خطیب، سحر طراز انشاء پرداز اور دلکش خاکہ نگار ہیں، انھوں نے اپنی مقبول عام کتاب "پرانے چراغ" کی تین ضخیم جلدوں میں مختلف علمی و ادبی اور دینی شخصیات کا جیتا جاگتا مرقع پیش کردیا ہے۔ یہ تمام مرقع اتنے واضح، پرکشش اور دلفریب ہیں کہ بلاشبہ ان سے ہمارے ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے خاکہ نگاری کی بنیادی شرط یہ ہے کہ خاکہ نگار نے اپنے موضوع کو قریب سے دیکھا ہو اور

اس سے متأثر ہوا ہو۔ مولانا نے پرانے چراغ میں اپنے دور کی ایسی ہی شخصیتوں کے مرقع پیش کئے ہیں، جن سے مولانا کا کسی نہ کسی طرح کا قریبی تعلق رہا ہے اور جن کے بعض معمولی اور غیر معمولی پہلوؤں سے وہ متأثر ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ باکمال شخصیات کا یہ صرف قلمی مرقع ہی نہیں بلکہ دین و اخلاق اور ادب و سوانح کا ایک ایسا مہکتا ہوا گلدستہ ہے جو عصر حاضر کے درجنوں بلند پایہ علماء مشائخ، اساتذہ کرام اور ادبی و شعری اور سماجی و سیاسی اصحاب پر مشتمل ہے۔ ان میں خاص طور سے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، جگر مرادآبادی، ڈاکٹر سید محمود اور ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی قابل ذکر ہیں، اسی طرح دوسری جلد میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ماہر القادری اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاکہ نگاری دراصل چہرہ نویسی اور پیکر تراشی کا فن ہے، اس میں موضوع کے چہرے کی کئی ایک زاویوں سے تصویر پیش کی جاتی ہے اور ضمنی طور پر سیرت کے نمایاں پہلو پیش کیے جاتے ہیں، کیونکہ انسان کا چہرہ محض ظاہری خدوخال ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کے باطن کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے، یہ دیکھ کر حیرت انگیز مسرت ہوتی ہے کہ مولانا کو قلمی تصویر کشی میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے، بطور نمونہ صرف دو اقتباس دیکھئے:

> "پیشانی سے خود اعتمادی اور بلند طالعی نمایاں، لباس خالص دہلی و لکھنؤ کے شرفاء بلکہ رؤساء کا سا سادہ لیکن حسن مذاق اور نستعلیقی ہر چیز سے عیاں، ٹوپی ذرا بلند جس میں ان کی انفرادیت جو ان کی ذات کا جوہر بن گئی تھی، نمایاں پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، یہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد جن کو میں نے پہلی بار دیکھا۔"

> "وہاں ایک بلند و بالا قد کے خوش رو وجیہہ جوان تھے، دوہرا بدن، کھلتا

ہوا گندمی رنگ، چہرہ پر خوبصورت داڑھی، آنکھیں روشن جن سے ذہانت وبلند نگاہی عیاں، کشادہ پیشانی، سر سے پاؤں تک کھدّر میں ملبوس، یہ تھے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جو نئے نئے جرمنی سے آئے تھے اور۔۔۔"

ان مختصر اقتباسات سے مولانا کی مصورانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ طوالت کا خوف مانع ہے، صرف ایک اقتباس مولانا محمد علی جوہر کے تذکرہ سے نقل کرتا ہوں جو مولانا علی میاں ندوی کی نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہے:

"اللہ نے محمد علی کو وہ سب صلاحیتیں اور کمالات عطا فرمائے تھے جو ایسے رہنماؤں کے لیے ضروری ہیں، جو ملکوں اور قوموں میں انقلاب لاتے ہیں، سوتی بستی جگاتے ہیں اور مولوں کو شہباز سے لڑا دیتے ہیں، خلوص کا ایک دریائے بیکراں، پارے کی سیمابی اور بجلیوں کی بے تابی، خطابت کی جادوگری شخصیت کی دلآویزی، خلقی وفطری محبوبیت ومومنی اور سب سے بڑھ کر دل کی وہ چوٹ اور جگر کا وہ زخم جو اس درجہ میں (شیخ الہند مولانا محمود حسن کو مستثنیٰ کرکے) ان کے ساتھیوں میں سے کم کسی کے حصّہ میں آیا تھا۔"

مضمون کے آخری حصّے میں اس جامع صفات ہستی کے علمی کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کو بہت کم لوگوں نے پہچانا اور اس میں بھی شبہہ ہے کہ انھوں نے خود بھی پہچانا یا نہیں، اور یہ کوئی عیب نہیں؟ ایک ایسی مختلف الحیثیات اور جامع صفات ہستی کی تعریف ہے، جس کا ہر پہلو مرکزی اور بنیادی معلوم ہوتا ہے، اور تماشائی محوِ حیرت بن کر کہتا ہے ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یہ واقعہ بہت سے باکمالوں کے ساتھ پیش آیا ہے کہ ان کے کمالات کی کثرت وتنوع، ان کے حقیقی کمالات کے لیے حجاب بن گیا اور بعض اوقات وہ بھی

آخر تک فیصلہ نہ کرسکے کہ ان کا جوہر اصلی کیا ہے، اور ان کو اپنی توانائیوں اور خداداد صلاحیتوں کو کس نقطہ پر مرکوز کردینا چاہیے، ان کی انگریزی زبان پر اہل زبان کی سی قدرت اور کسی انگریز ادیب کے بقول "برکلے کی زبان اور میکالے کا قلم" صحافت میں جو اپنی بے اصولی کے لیے بدنام ہے، اصول پسندی، راست گفتاری، اہم مجلسوں اور نازک موقعوں پر حاضر دماغی وحاضر جوابی، جابر طاقتوں اور غالی معتقدوں دونوں کے سامنے کلمۂ حق کا اظہار، قوت ایمانی وعشق رسول، اسلام کے ساتھ وفاداری اور ملّت کا درد اور سب سے بڑھ کر دینی حمیت اور اسلامی غیرت کس چیز کو سراہا جائے اور کس کو ان کا امتیازی وصف قرار دیا جائے۔ بحیثیت شاعر کے بھی ان کا مقام بلند ہے اور اس قابل کہ اس کو مستقل موضوع بنایا جائے، زبان کی سادگی، کلام کی تاثیر، جذبات کی گہرائی، ان کا کلام بھی (اگر بے ادبی نہ ہو تو خواجہ میر درد کی طرح) سراپا انتخاب اور پیغام سروش ہے۔"

مولانا علی میاں صاحب کے طرز تحریر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں بیجا جوش کہیں نہیں ملتا، جبکہ زور ہر جگہ نظر آتا ہے۔ یہ زور بیان دراصل ان کے فکر و نظر کی دین ہے، مولانا صاحب نظر بھی ہیں اور صاحب دل بھی، جب فکر کے ساتھ ذکر بھی ہو تو کیا کہنا۔ انھوں نے ہمیشہ سنجیدہ و متین انداز میں نہایت گہری باتیں پیش کرکے "از دل خیزد بر دل ریزد" والی کیفیت پیدا کی ہے۔ آپ نے علمی، دینی، سماجی اور ثقافتی عنوانات پر نہایت دلنشیں اور مؤثر زبان میں جو کچھ لکھا ہے، ان سب کا احاطہ اس مختصر مضمون میں کرنا محال ہے، تاہم اب تک کی گفتگو میں آپ کی نثر نگاری کے فنّی محاسن اور اسلوب بیان کے مختلف پہلوؤں پر جو چند اشارے کیے جاسکے ہیں وہ میری تسلّی کے لیے کافی ہیں۔

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی
صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا

# پرانے چراغ کی فنی عظمت

## پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ملک کے معروف متبحر عالم دین صاحب نظر سوانح نگار بلند پایہ مؤرخ اور اردو کے صاحب اسلوب ادیب ہیں جنھوں نے تاریخ دعوت وعزیمت پانچ ضخیم جلدوں میں تصنیف کی ہے وہ ایک عظیم مفکر اسلام بھی ہیں جنھوں نے "مسلمانوں کے انحطاط سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" جیسی عالمانہ تصنیف پیش کی ہے۔ ادھر انھوں نے کچھ توجہ اردو کے تخلیقی ادب کی جانب مبذول فرمائی ہے۔ انھوں نے "پرانے چراغ" کے نام سے خاکے لکھنے شروع کئے اور ان میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ اس کے ۴ حصے شائع ہو گئے۔ اردو خاکہ نگاری میں یہ کتاب سنگ میل اور نشان منزل بن گئی۔ پھر حضرت مولانا نے اپنی خودنوشت کی جانب توجہ فرمائی یہاں تک کہ اس کے چھ حصے شائع ہو گئے یہ خودنوشت بھی اردو ادب میں ایک غیر معمولی عظمت کی حامل ہے کہ اتنی مفصل خودنوشت اب تک کسی نے تصنیف نہیں کی۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اب تک اتنے بڑے اردو ادیب کی جانب کسی نے توجہ نہیں کی۔ "پرانے چراغ" اور "کاروان زندگی" کی فنی عظمت واضح نہیں کی گئی۔

سچی بات یہ ہے کہ مولانا ایک فطری ادیب ہیں۔ عربوں نے کہا ہے کہ (الادب لاموضوع لہ) ادب کا کوئی موضوع مقرر نہیں۔ فطری ادیب وہ ہے کہ جس چیز کو وہ چھولے

وہ ادب بن جائے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اردو کے اتنے بڑے ادیب تھے مگر ان کا اپنا موضوع کبھی ادب نہیں رہا۔ پہلے فلسفہ تھا اور عبدالماجد فلسفی کہلاتے تھے پھر تفسیر ہوگیا اور مولانا کہلانے لگے۔ ہر چند کہ مولانا علی میاں مدظلہ العالی کا موضوع جستجو تاریخ اور مذہب رہا ہے مگر انھوں نے عمر کا بڑا حصّہ مذہبی سوانح عمری لکھنے میں صرف کیا ہے۔ کتاب پرانے چراغ بھی اپنی روح کے لحاظ سے سوانح حیات میں شامل کی جاسکتی ہے۔ مگر کاروانِ زندگی کی شان نرالی ہے اور پھر سوانح عمریوں کا ایک پورا سلسلہ ہے علماء اور صوفیہ کی۔ بلا کسی تذبذب کے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت پورے ملک میں بلکہ برصغیر ہندوپاک میں اتنا عظیم سوانح نگار اردو میں کوئی دوسرا نہیں۔ اردو میں حضرت مولانا کی سوانح عمریاں عظیم فنّی حیثیت رکھتی ہیں مگر وہ ایک دوسرا موضوع ہے میں اس مقالہ میں ان کی کتاب پرانے چراغ کا فنّی جائزہ لینا چاہتا ہوں تاکہ اردو ادب میں اس اہم ادبی کتاب کا مقام متعین کیا جاسکے۔

حق یہ ہے کہ کتاب "پرانے چراغ" اردو ادب کی پیشانی کا نور ہے۔ اس میں مولانا نے قلم کاری نہیں کی ہے بلکہ ساحری کی ہے اس کتاب کا گوشہ گوشہ منوّر ہے اور ہر طرف مولانا کی ادبی عظمت مصوّر ہے۔ اس میں مولانا نے ایسے جیتے جاگتے خاکے پیش فرمائے ہیں کہ ان تمام شخصیتوں کو اردو خاکہ نگاری میں حیات جاوداں عطا کردی ہے جن کو چھو لیا ہے۔ کتنے غیر معروف لوگوں کو ابدی زندگی عطا کردی ہے ان کا ہر خاکہ خود اپنی کائنات رکھتا ہے ان کی دلکش کردار نگاری، واقعات کو تسلسل اور دلکشی سے بیان کرنے کی صلاحیت اور ہزاروں واقعات و حوادث میں سے ان واقعات کو منتخب کرنے کا سلیقہ جن سے کردار اور سیرت کے پہلو نمایاں ہوں، مولانا کو عظمتِ فن عطا کرتا ہے۔ وہ تصویر کشی نہیں جادوگری کرتے ہیں۔ وہ اپنے اندرونی جذبات کو دوسروں کے دلوں میں جاگزیں کرنے اور دوسروں کو اپنے گذرے ہوئے واقعات سے متعارف کرانے کے فن سے خوب واقف ہیں وہ ہم کو اپنے ساتھ اس دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں مولانا نے بڑی پاک، دلکش اور علمی زندگی، علماء، اکابر، اہل نظر، اہل خاندان، صوفیائے کرام، بزرگان دین اور بعض شعراء و ادباء کے ساتھ گذاری ہے جن کا مولانا کا مدتوں ساتھ رہا ہے۔ دوسرے

الفاظ میں کاروان زندگی مولانا کی آپ بیتی ہو یا جگ بیتی ہو مگر پرانے چراغ مولانا کے دوستوں بزرگوں، خوردوں ساتھیوں اور رفیقوں کا نہایت حسین و دلکش مرقع ہے جن کے ساتھ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے زندگی گذاری ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ پورا کارواں ان کے ساتھ ساتھ رواں دواں ہے جن کے درمیان انھوں نے شب و روز بسر کئے ہیں اور جن کا ساتھ مولانا کا برسہا برس رہ چکا ہے۔ پھر جب اس پس منظر میں مولانا نے قلم اٹھایا ہے تو قلم کا ساتھ قلب نے بھی خوب دیا ہے اور ماضی کا بیان اور شخصیتوں کی تصویر کشی حضرت نے بڑی سرشاری اور فطری انداز سے کی ہے اس بنا پر مولانا نے اس کتاب میں قلم کے جوہر کے ساتھ قلب کی سوزش کے جلوے بھی خوب دکھائے ہیں حسرتوں اور عبرتوں کے مواقع جگہ جگہ سامنے آئے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی اور انسانی تدبیر کی بے بسی کے نقشے تقدیر کے سامنے خوب پیش کئے ہیں۔ یہ سنجیدگی متصوفانہ فضا اور گہرا اسلامی ماحول مولانا کو لطائف بیان کرنے سے باز نہیں رکھتا۔ حضرت ایسے دلکش لطیفے بھی بیان فرماتے ہیں کہ یہ قصے کرداروں کو اور شخصیتوں کو مصور کر دیتے ہیں۔

مولانا کی تحریروں میں ان کی اپنی شخصیت کی دل کشی و رعنائی ہے وہ جان بوجھ کر عبارت آرائی کبھی نہیں کرتے۔ مولانا الفاظ اور ترکیبیں مخصوص انداز سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے جملے طویل ہوتے ہیں یہ طویل جملے نہایت منتخب عربی اور فارسی الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں، ان کا اپنا ایک مخصوص طرز نگارش ہے وہ مخصوص و متمیز اسلوب کے حامل ہیں۔ یہ اسلوب ان کو اس طرح ممتاز کرتا ہے جس طرح اُردو کے بڑے بڑے ادبا اپنے اسلوب سے جانے جاتے ہیں۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ۔ مولانا درمیان درمیان بڑے خوبصورت اشعار عبارت میں جڑ دیتے ہیں اور یہ انداز مولانا ابوالکلام اور مولانا شبلی کا ہے کہ دونوں حسب موقع اشعار پیش کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں خصوصاً مولانا آزاد تو اس فن میں نہایت ممتاز ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی نہایت برمحل اُردو فارسی اور عربی اشعار پیش کرتے ہیں اُردو زیادہ فارسی کم اور عربی اس سے بھی کم۔ لیکن مولانا آزاد کے یہاں فارسی اشعار زیادہ پھر عربی اور اردو اشعار کم سے کم تر

نظر آتے ہیں۔

مولانا کا اسلوب بیان ممتاز خصائص کا حامل ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک طاقت ور اسلوب کے حامل ہیں۔ الفاظ کے حسین اور دلکش انتخاب میں ان کو ملکہ حاصل ہے پھر بھی معانی کے غلبہ اور جذبات کی کثرت کے باعث عبارت میں کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مصنف عربی عبارت عمداً لکھنا چاہتا ہے۔ ان کی عبارتوں میں اعلیٰ ادبی ذوق کی ترجمانی ہوتی ہے، وہ ایسے الفاظ اور ایسی عبارت نہیں لکھ سکتے جو حسن ذوق پر پوری نہ اترتی ہو، وہ ایک بلندی سے لکھتے ہیں اور یہ بلندی اور معیار خواہ علمی عبارت ہو یا اسلامی مسئلہ پر بحث ہو یا کسی ادیب و شاعر پر تبصرہ لکھنا ہو یا کوئی خط ہو ہر جگہ قائم رہتا ہے۔ مولانا کے قلم سے جو کچھ نکلتا ہے اس پر ان کے اسلوب کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ اور یہی ایک بڑے ادیب کی پہچان ہے۔ اس لیے کہ ادیب اپنے ادب میں اپنی شخصیت پیش کرتا ہے اگر شخصیت کمزور ہے تو ادب طاقتور نہیں ہو سکتا۔ مولانا کی شخصیت ان کے طاقتور اسلوب میں پوری طرح جلوہ گر ہے جس میں ایک طرف اردو اور فارسی کے حسن ذوق کی ترجمانی ہے تو دوسری طرف عربی ادب کی حسین لہریں بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں ثقافتوں کے امتزاج سے مولانا کے اسلوب میں ایک بلندی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ قوس قزح کی طرح مختلف رنگوں اور کیفیتوں کا ترجمان ہے۔

اب میں مولانا کے اسلوب بیان کی کچھ ممتاز خوبیاں بیان کرنا چاہتا ہوں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ جملے طویل لکھتے ہیں جملہ پڑھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا بول رہے ہیں یہ ایک بڑے ادیب کی پہچان ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولانا آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے چند جملے رکھ دیئے جائیں والا فوراً تاڑ لے گا کہ کون بول رہا ہے، پس مولانا ابوالحسن موجودہ دور میں ایک عظیم نثار اور ادیب ہیں جو اپنا ایک مخصوص و ممتاز اسلوب رکھتے ہیں جس میں جملے طویل ہوتے ہیں اور ان جملوں کی طوالت اور بڑھ جاتی ہے بریکٹ کے ذریعہ۔ وہ تشریحی بریکٹ لگانے کے عادی ہیں ایک جملہ لکھ کر پھر بریکٹ یا قوسین میں وہ اس کی تشریح بھی

کرتے جاتے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ نہ تو ان کے طویل جملے اکتاہٹ پیدا کرتے ہیں اور نہ ان کے قوسین سے قاری کو الجھن ہوتی ہے بلکہ دونوں سے طبیعت میں انشراح اور قوسین سے توضیح پیدا ہوجاتی ہے۔

مولانا کے اسلوب کی ایک خوبی درمیان درمیان انگریزی الفاظ انگریزی رسم الخط میں لکھنا بھی ہے یہ کیفیت مولانا مودودیؒ صاحب کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ مولانا اکثر اردو ترجمہ کے ساتھ اور کبھی صرف انگریزی لفظ لکھ کر جدید انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن سے قریب ہوجاتے ہیں یا ان کو اپنے سے قریب کرلیتے ہیں۔ سرسیدؒ اور حالیؒ دونوں انگریزی الفاظ اردو رسم الخط میں لکھنے کے عادی ہیں مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی انگریزی الفاظ انگریزی زبان میں لکھتے ہیں لیکن یہ موضوع کی مناسبت سے ہوتے ہیں وہ اپنی تقریروں میں بھی انگریزی الفاظ سے کام لیتے ہیں۔

مولانا کے اسلوب پر یہ طویل بحث اس بنا پر کی گئی ہے تاکہ ہم یہ عرض کرسکوں کہ ان کے اسلوب بیان کی سب سے عمدہ ترجمانی "پرانے چراغ" میں ہم کو نظر آتی ہے۔ یہ کتاب مجموعۂ خوبی ہے۔ اس میں اعلیٰ افکاری، کردار سازی کا نہایت مؤثر مواد اور اعلیٰ اخلاق کے ترجمان واقعات موجود ہیں۔ مجھے یہ لکھنے میں ذرا بھی تأمل نہیں کہ مولانا اصلاً ایک صاحب نظر مؤرخ اسلام ہیں ان کا سارا کام اسلامی تاریخ کے ایک گوشہ سے متعلق ہے یعنی انھوں نے اسلام کی ثقافتی تاریخ لکھی ہے علماء اسلام کی تاریخ مرتب کی ہے۔ ان کا اصل میدان سیرت نگاری ہے وہ سوانح نگاری کے امام ہیں انھوں نے آنحضرتؐ کی سوانح حیات نبی رحمت کے نام سے لکھی پھر حضرت علی کی سوانح المرتضیٰ لکھی۔ ان کے علاوہ ان کی مشہور کتاب تاریخ دعوت و عزیمت ۵ جلدوں میں علمائے اسلام کی سوانح حیات اور ان کے پیام وکارناموں کی تشریح پر مشتمل ہے۔ سیرت سید احمد شہیدؒ، مولانا محمد الیاس، مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا شاہ یعقوب مجددی، مولانا زکریا کاندھلوی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سوانح عمریاں مولانا کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ اب انھوں نے "پرانے چراغ" کے نام سے دراصل اسی سلسلہ کی تکمیل کی ہے جو اسلامی ثقافت کی تاریخ وہ مدت سے لکھ رہے ہیں۔ یہ کتاب علمائے ہند کی، ان کے اداروں ان کے ثقافتی مراکز اور ان کے مسائل و تہذیبی زندگی کا ایک دلکش مرقع مولانا نے اس کتاب

میں پیش کردیا ہے علمائے ہند کا اس سے بہتر ذہنی خاکہ اور ثقافتی ترجمانی ہم کو کہیں اور نہیں مل سکتی۔ وہ داعیٔ اسلام بھی ہیں اور پیام انسانیت کے ترجمان بھی۔ ان کا انداز مصلحانہ ہے۔ وہ اپنی نثر میں اشعار لاکر نگینہ کی طرح جڑ دیتے ہیں کہ اگر ان کو عبارت سے نکال لیا جائے تو تحریر پھیکی پڑ جائے۔ عربی، فارسی اور اُردو اور خود قرآن مجید سے وہ اپنی عبارتوں میں عمدہ اشعار اور مناسب آیات اس طرح چسپاں کردیتے ہیں کہ عبارت میں جان پڑ جاتی ہے۔

یہ کتاب عربی مدارس کی ذہنی تاریخ ہے اس میں وہ ماحول اور تہذیبی کیفیت ہے جس کا مشاہدہ ندوہ کی فضا میں کیا جا سکتا ہے۔ مولانا نے ہزاروں واقعات لکھ کر درحقیقت خود اپنی سوانح عمری کا اصل جیتا جاگتا مواد فراہم کردیا ہے اور ندوہ کی تاریخ بھی اس میں آگئی ہے۔ بلکہ یہ کتاب ان تمام دینی لہروں اور تحریکوں کا عکس جمیل پیش کرتی ہے جن میں مولانا نے اپنی زندگی گذاری ہے۔

علماء کے علاوہ ہندوستان کے صوفیاء خصوصاً مولانا کے معاصرین صوفیہ کے حالات اور معمولات بڑی تفصیل سے پرانے چراغ کی زینت بن گئے ہیں اور یہ مولانا کا محبوب موضوع رہا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حالات دیکھئے، مولانا شاہ وصی اللہؒ کا تذکرہ پڑھئے یا خود مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ذکر دیکھئے تصوف کی چاشنی ہر جگہ آپ کو نظر آئے گی۔

واقعات، اسلامی ذہن بنانے والے کردار، فکر و فن کی ترجمانی، اور اشخاص کی ہو بہو تصویریں ہیں خاکے نہایت کامیاب ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مُردوں پر شیر ہیں اور زندوں سے ڈرتے ہیں۔ کچھ یہی عالم مولانا ابوالحسن کا بھی ہے کہ ان کی پہلی شرط خاکہ نگاری کی ہے کہ آدمی مرجائے ورنہ اس موضوع پر وہ قلم نہ اٹھائیں گے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مُردوں پر شیر ہیں اور زندوں سے ڈرتے ہیں اس لیے کہ انھوں نے بعض علماء و صوفیاء کی سوانح حیات ان کی زندگی میں لکھی۔ مولانا شاہ یعقوب مجددی کے ملفوظات ان کی زندگی میں مرتب کئے۔ مولانا زکریا محدث کاندھلوی کی سوانح بھی ان کی زندگی میں لکھی۔ جب میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ پرانے چراغ میں مولانا محمد الیاسؒ

مولانا محمد زکریاؒ اور مولانا عبدالقادرؒ رائے پوری کا ذکر نہیں ہے تو فرمایا کہ جن اشخاص اور معاصرین پر کتابیں لکھ چکا ہوں ان کا ذکر پرانے چراغ میں نہیں کیا گیا۔

مولانا گل و بلبل کی داستان ہم کو نہیں سناتے وہ اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں کرتے بلکہ زندگی کے واقعات، حقائق حیات کی تصویریں، اور انسانی کرداروں کے جلوے کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تصویریں بولتی نظر آتی ہیں واقعات مجسم ہو کر نگاہوں کے سامنے کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہم کو ہمارے ذہنی ماحول سے کھینچ کر اس ذہنی ماحول میں پہنچا دیتے ہیں جہاں مولانا خود موجود ہوتے ہیں۔ یہی مولانا کا کمال فن ہے، اس فن کی عظمت یہ ہے کہ مولانا ایک فضا بناتے ہیں اور ماحول پیدا کرتے ہیں۔ اس فضا میں کردار سے متعلق ایسے واقعات سامنے لاتے ہیں کہ ان واقعات اور ماحول میں تناسب و توافق کے باعث ایک فطری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ واقعات کو اس طرح مناسبت سے پیش کرتے ہیں کہ انسان ان سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ان کے خاکوں کی ایک خوبی وہ خطوط ہیں جو مولانا نے نہایت مناسبت سے پیش کئے ہیں۔ اہل نظر اور اہل کمال کے کتنے ہی خطوط مولانا نے خاکوں میں اس طرح ڈھال دیئے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینے۔ یہ خطوط واقعات کی ہو بہو تصویریں پیش کرتے ہیں کرداروں کو روشن کرتے ہیں۔ صاحب سیرت کے اسلوب کو نمایاں کرتے ہیں اور اس کے فکر کو اجاگر کرنے میں نہایت ممد و معاون ہیں۔ ان خطوط کا انتخاب بڑی ژرف نگاہی سے کیا گیا ہے اس طرح کافی خطوط اہل علم کے پرانے چراغ کے نگار خانہ میں محفوظ ہو گئے ہیں بلکہ ان کو حیات ابدی مل گئی ہے۔

مولانا جب مولانا احمد علی لاہوری کے درس قرآن میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لے گئے اور مولانا نے لاہور کی زندگی، تقویٰ اور خوف خدا کا مشاہدہ کیا تو ان سے متأثر ہوئے اور ایک دن درخواست کر دی کہ ان کو مرید کر لیا جائے۔ اس پر مولانا لاہوری نے فرمایا کہ ابھی خود ان کے شیخ خلیفہ غلام محمد صاحب دین پوری زندہ ہیں انھوں نے مولانا علی میاں کو

ایک خط دے کر دین پور روانہ کر دیا۔ اب حضرت مولانا کی زبان سے دین پور کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے:۔

"غرض ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء کے جون کی کوئی تاریخ تھی کہ میں کراچی میل سے خان پور کے لیے روانہ ہوا۔ ایک رفیق درس اور دوست مولوی محمد موسیٰ رفیق سفر تھے جو خود بڑے صاحب صلاح اور قوی الاستعداد نوجوان تھے مغرب کو ہم لوگ خان پور پہنچے وہاں سے دین پور کی طرف روانہ ہوئے۔ غالباً رات ہی کو حضرت کی زیارت ہوگئی۔ ایسا منوّر چہرہ غالباً اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا، نہایت کم گو اور کم سخن بزرگ تھے گفتگو بھی فرماتے تو ٹھیٹھ ریاستی زبان میں جو ملتانی اور سندھی کا مجموعہ ہے اور جس سے میں بالکل ناآشنا تھا۔ دین پور کی دنیا ہی نرالی تھی۔ وہ صحیح معنی میں دین پور تھا۔ قادری طریقہ پر ذکر جہر سے مسجد و خانقاہ اور بستی ہر وقت گونجتی رہتی تھی۔ اگر کوئی کسی کو آواز دیتا تو پکارنے والا بھی اِلاّ اللہ کہتا اور جواب دینے والا بھی اِلاّ اللہ ہی سے جواب دیتا۔ اسی طرح اذان، ذکر جہر اور صدائے اِلاّ اللہ کے سوا کوئی اور بلند آواز سننے میں نہ آتی۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں صرف حضرت اور حضرت کے متعلقین آباد تھے۔ نیم خام نیم پختہ چند مکانات جن کی تعداد شاید ۵۔۷ سے زیادہ نہ ہو۔ ایک سادہ سی مسجد، چند خام حجرے ذاکرین کے لیے کچھ کھجوروں کے درخت جن کو دیکھ کر عرب کے بادیہ کی بستیاں یاد آتی ہیں آب و ہوا بھی بادیۂ عرب سے ملتی جلتی تھی۔ مقیمین خانقاہ کے لیے ایک لنگر تھا جس میں خالص سندھی اور بھاولپوری مذاق کا ایسا کھانا تیار ہوتا جو قوت لایموت کا صحیح مصداق تھا اور ہم اودھ کے نازک مزاج مہمانوں کے لیے اس کا کھانا بڑا مجاہدہ اور امتحان تھا۔ گرمی شدّت کی تھی۔ دن بھر لو چلتی رات میں کسی قدر ٹھنڈک ہوتی۔ حضرت خلیفہ صاحب کی عمر اس وقت بھی نوّے ۹۰ سال

سے متجاوز تھی۔ مولانا احمد علی صاحب کا خط آپ کو سنایا گیا جس میں غالباً حضرت سیّد صاحب کی نسبت سے میرا تعارف کرایا گیا تھا۔ حضرت نے سلسلہ میں داخل فرمایا اور ذکر قلبی کی تلقین کی۔ جس وقت رخصت ہونے لگا تو فرمایا اُن کو سلام کہہ دینا، میں نہیں سمجھ سکا کہ اشارہ کس طرف ہے۔ صاحبزادے میاں عبدالہادی صاحب پاس سے گذر رہے تھے انھوں نے فرمایا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کو، مولانا کا نام سنتے ہی خلیفہ صاحب پر رقّت طاری ہوگئی۔ اس سے اس تعلّق کا اندازہ ہوتا ہے جو ان دونوں بزرگوں کے درمیان تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا تھانوی ایک مرتبہ کراچی سے آتے ہوئے خلیفہ صاحب کی زیارت اور ملاقات کے لیے دین پور ٹھہرے تھے۔"

(پرانے چراغ حصّہ اوّل ص ۱۴۹۔۱۵۰)

مذکورہ بالا اقتباس میں جو تصویر کشی ہے اور فطری انداز بیان ہے وہ غیر معمولی مؤثر ہے انسانی طبائع کا ان سے متأثر ہونا یقینی ہے۔ مختلف واقعات و احوال و کوائف کا جو بیان حضرت نے فرمایا ہے جو نقشہ اس گاؤں دین پور کا کھینچا ہے ان سب کو پڑھ کر قاری پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ وعظ و نصیحت اور تصوّف کی کتابوں سے بڑھ کر ہیں۔ انھیں مولانا احمد علی لاہوری کے صاحبزادے مولانا حبیب اللہ صاحب پر حضرت نے ایک فُٹ نوٹ لکھا ہے جو تصوّف، زہد، اتّقا اور عبادت و ریاضت کا عجیب مجموعہ ہے بلکہ تصوّف کے اشغال و نتائج کا عطر مجموعہ ہے فرماتے ہیں کہ:

مولانا حبیب اللہ صاحب تقریباً ۲۵ سال سے حرمین شریفین میں مقیم تھے۔ اس عرصہ میں وہ کبھی وہاں سے باہر نہیں گئے۔ ابتداء کے دس بارہ سال انھوں نے مدینہ طیبّہ میں گذارے اور بہت پابندی سے مسجد نبوی میں اپنے والد ماجد کے طرز پر درس دیا۔ پھر بعض مجبوریوں کی بنا پر مکّہ معظّمہ میں سکونت اختیار کرلی۔ وہیں جان جان آفریں کے سپرد کی۔ اس پورے قیام میں

ریاضت شاقہ، طویل مدّت تک مسلسل روزے اور تقلیل طعام و منام کا معمول رہا، پوری زندگی تجرد اور انقطاع میں گزاری۔ آخر میں یکسوئی اور خلوت پسندی کا اتنا غلبہ ہوگیا تھا کہ چند گھنٹے احباب و خدام کے سوا جن سے خاص مناسبت اور اتحاد ذوق تھا کسی سے ملنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ ذکر کا بڑا غلبہ تھا اور زندگی بالکل زہد و قناعت بلکہ مجاہدہ کی تھی۔ آخر میں کسی سے خدمت لینا اور علاج و معالجہ بھی گوارا نہیں تھا۔ علالت کے آخری دنوں میں ایک دوست نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ بھائی میں نے باری تعالیٰ سے رجوع کیا، علاج بے سود ہے بس دعا کرو۔ محبّی معراج الحسن صاحب مقیم مکّہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "تین دن پہلے بے چینی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ فرمایا جمعہ تک انتظار کرو انشاء اللہ جمعہ تک بالکل تندرست ہو جاؤں گا۔ بس دعا کرتے رہو انتقال سے چند منٹ پہلے دیوار سے سہارا لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا الحمدللہ، اللہ نے میرا کام بنا دیا، کلمہ شریف پڑھا اور رخصت ہو گئے۔"

مولانا عالم و حافظ اور فاضل دیوبند تھے، ان کو اپنے والد مولانا احمد علی صاحبؒ سے اجازت و خلافت بھی تھی، حالات نہایت رفیع تھے، ریاضات شاقہ اور علو استعداد کی بنا پر والد ماجد کی طرح کشف اور اشراق بہت بڑھا ہوا تھا۔"

ایک دوسری جگہ حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب کا ذکر مولانا اس طرح فرماتے ہیں:۔

"حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب پر جمال کا غلبہ تھا بڑے صاحب سکینت و تمکین تھے۔ چہرۂ مبارک گلاب کی طرح سرخ اور آفتاب کی طرح پُرانوار رہتا تھا، نہایت صاحب وجاہت اور صاحب جمال تھے، عرصہ تک دستور رہا کہ بھاول پور کا جب کوئی نواب گدّی پر بیٹھتا تو خود ہی اس کی دستار بندی گویا تاج پوشی فرماتے، تقریباً ناخواندہ تھے، میں نے جب ۱۹۳۱ء

میں زیارت کی تو اس وقت کسی استاد کے سامنے قرآن مجید کی تصحیح فرماتے تھے، پنجاب و سندھ کے تمام مشائخ ان کے علو مرتبہ، قوت نسبت اور ان کی بزرگی کے قائل تھے۔" (ج اول ص ۱۴۸)

ان اقتباسات سے تصوّف کی ترجمانی پوری طرح ہوتی ہے اور مولانا کے حسن اسلوب کی جلوہ گری بھی پوری عظمت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ تصوّف کے خشک موضوع کو مولانا نے نہایت دلکش انداز سے پیش کیا ہے۔

تصوّف کی چاشنی سے تو پوری کتاب مزیّن و منوّر ہے اب میں اتنی سنجیدہ کتاب سے چند لطائف بھی نقل کرتا ہوں تاکہ قارئین کرام یہ محسوس کر سکیں کہ یہ کتاب اپنے اندر دلکشی اور زندہ دلی کا بہت کچھ سامان رکھتی ہے۔

"مولانا عبدالسّلام قدوائیؒ قرآن مجید بھی بہت سادہ پڑھتے تھے اکثر وہ لطیفہ یاد دلاتے تھے کہ ایک مرتبہ وہ دارالعلوم کی مسجد میں نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شوخ و ذہین طالب علم نے ایک دوسرے طالب علم سے وضو کرتے ہوئے کہا کہ "جلدی کرو آج نماز اردو میں ہو رہی ہے" اکثر مسکراتے ہوئے کہتے ہیں تو نماز بھی اردو میں پڑھاتا ہوں لیکن ان کا یہ وصف جو دوسروں کی نگاہ میں بعض اوقات نقص معلوم ہوتا ہے، حقیقت پسندوں کی نگاہ میں اس دور تصنّع اور تکلّف میں بلکہ دور نفاق و ریا میں بڑا کمال اور قابل رشک صفت تھی۔"

(ج ۲ ص ۲۹۷)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی پر جو کچھ بھی مولانا نے لکھا ہے وہ نہایت دلکش ہے الہامی زبان میں ہے اور ساحرانہ اسلوب کی ترجمانی ہے۔

مولانا مسعود علی ندویؒ کے لطائف میں سے حضرت مولانا نے چند لطیفے بھی بیان فرمائے ہیں۔ ان میں ایک لطیفہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"ایک بزرگ جو سرکاری خطاب یافتہ بھی تھے اور پیر بھی، علماء میں ان کا شمار

ہوتا تھا لیکن اعزازی طور پر، با قاعدہ کسی مدرسہ میں ان کی تعلیم نہیں ہوئی تھی، جمعہ کی نماز پڑھانے کا ان کو بہت شوق تھا بلا تحریک و فرمائش کے بھی وہ مصلّے پر چلے جاتے۔ ایک مرتبہ وہ دار المصنفین آئے۔ جمعہ کا دن تھا۔ مولانا ان کی کمزوری سے واقف تھے اور ان کو سبق دینا چاہتے تھے ان کو معلوم تھا کہ وہ خطبہ کی کتاب کے بغیر خطبہ نہیں دے سکتے، حکم دیا کہ خطبہ کی کتاب مسجد سے غائب کردی جائے اور آس پاس کہیں خطبہ کی کتاب موجود نہ ہو جو منگوائی جاسکے۔ یہ سب انتظام کرنے کے بعد وہ مطمئن ہوگئے۔ اور لوگ منتظر رہے کہ آج کیا پیش آتا ہے نماز کا وقت ہوا وہ صاحب حسب معمول منبر پر چلے گئے۔ خطبہ کی کتاب لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو آس پاس کہیں اس کا وجود نہ تھا۔ باہر تلاش کی گئی تو وہاں بھی نہ ملی۔ اب لوگ منتظر تھے کہ کیا ہوگا۔ مولانا کو اپنی پیش بندی پر اطمینان تھا اور خیال یہ تھا کہ وہ صاحب ہار مان جائیں گے اور منبر سے اتر آئیں گے لیکن سب لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ان صاحب نے اپنی عبا کے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خطبہ نکالا جو ایسے آڑے وقت (ایمرجنسی) کے لیے رکھا گیا تھا اور وہ سارا منصوبہ فیل ہوگیا۔" (ج ۲ ص ۱۰۴)

اس مقالہ میں مولانا رقمطراز ہیں کہ مولانا مسعود علی ندوی صاحب اور جواہر لال نہرو نہرو کی کوٹھی پر زینہ سے اتر رہے تھے، نہرو ایک ایک زینہ چھوڑ کر قدم رکھتے تھے اور مولانا مسعود علی صاحب ہر زینہ پر قدم رکھ کر اتر رہے تھے اس پر نہرو بولے کہ مولوی مسعود آخر آپ کیوں نہیں میری طرح ایک زینہ چھوڑ کر قدم رکھتے۔ مولوی صاحب ہنسے اور بولے کہ اگر میں ہندوستان کا وزیر اعظم ہوتا تو ایک زینہ چھوڑ کر قدم رکھتا۔ (ج ۲ ص ۱۱۱)

مولانا کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہندی الفاظ کا استعمال بالکل نہیں فرماتے، ان کے اسلوب بیان میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب نہایت عمدہ انداز سے نظر آتی ہیں۔ عربی کے وہ الفاظ جو اجنبیت رکھتے ہیں مولانا ان کے قریب بھی نہیں جاتے۔ دراصل ان کی زبان

قلب کی زبان ہے، جذبات کی ترجمان ہے اور فکری انداز نظر کی حامل ہے۔ وہ ایک صاحب پیام مصلح ہیں، یہی اصلاحی کیفیت، یہی پیامی شان اور یہی پختہ فکر ان کے تمام خاکوں میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔

میں دو اقتباسات اور پیش کرنا چاہتا ہوں، ایک تو وہ عبارت جو مولانا نے علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کے خاکہ کے آخر میں لکھی ہے نہایت دلکش ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

"بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، وسعت نظر، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے والعجیب عند اللہ، تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں انھوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے، اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

وہ جب تک زندہ رہا اسی (رسول) کے گن گاتا رہا اور اپنی دیس کی بے تکلف بولی میں اس کو خطاب کر کے سناتا رہا۔

تجھ سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تیری گلی کی دھول بٹوروں!

یقین کامل ہے کہ خدا کی رحمت کاملہ نے اس کو اسی محبوب کے عشاق اور اس کے دین کے مخصوص خدام میں شامل فرمایا ہوگا جس کا کام کرتا ہوا وہ زندہ رہا اور جس کا نام لیتا ہوا وہ دنیا سے رخصت ہوا۔

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میر  کیا دوانے نے موت پائی ہے

دوسرا اور آخری اقتباس مولانا محمد علی کے مقالہ سے پیش کر رہا ہوں۔ حضرت مولانا نے اپنی پوری ادبی طاقت اس مضمون پر صرف کر دی ہے یہ ان کے طاقت ور اور دلکش اسلوب کا اعلیٰ نمونہ کہا جا سکتا ہے فرماتے ہیں:۔

"اللہ نے محمد علی کو وہ سب صلاحیتیں اور کمالات عطا فرمائے تھے جو ایسے رہنماؤں کے لیے ضروری ہیں جو ملکوں اور قوموں میں انقلاب لاتے ہیں، سوتی بستی جگاتے ہیں اور مموں کو شہبازسے لڑا دیتے ہیں، خلوص کا ایک دریائے بیکراں، پارے کی سیمابی اور بجلیوں کی بے تابی، خطابت کی جادوگری، شخصیت کی دلآویزی، خلقی و فطری محبوبیت اور سب سے بڑھ کر دل کی وہ چوٹ اور جگر کا وہ زخم جو اس درجہ میں (شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو مستثنیٰ کر کے) ان کے سابقوں میں سے کم کسی کے حصہ میں آیا تھا۔ یہی احساس و یقین تھا جس نے ان سے یہ شعر کہلائے جو ان کے حال کی سچی تصویر تھی:

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو — خوش ہوں کہ وہ پیغام وفا میرے لیے ہے

وہ ہندوستان کی ملّت اسلامیہ کے ملّی خصائص کا نقطۂ عروج تھے عقل پر محبت کی فرمانروائی، شمع کی جاں گدازی اور پروانہ کی جاں نثاری، ذاتِ نبوی سے عشق و شیفتگی، عالم اسلامی اور ملّت اسلامیہ سے حد سے بڑھی ہوئی فکر، عواقب و انجام سے بے پرواہی، حاتم دگراں و گدائے خویشتن کی پرانی خو، فقیری میں شاہانہ خیالات، احتیاج میں خودداری و عزّت نفس، استغناء و دولت کی حالت میں خاکساری و انکساری اور حضرت علیؓ کے مقولہ احذر واصولۃ الکریم اذا جاع واللئیم اذا شبع کی صحیح تصویر تھے[1]۔" (جلد ۲ ص ۱۶-۱۷)

---

[1] یعنی شریف آدمی کے دبدبہ اور طنطنہ سے ڈرو جب کہ وہ بھوکا ہو اور سفلہ طبیعت کے غل و غش سے ہوشیار رہو جب وہ شکم سیر ہو۔

مولانا کے قلم گہربار نے پوری کتاب میں حسن بیان کی چاندنی پھیلائی ہے اور فکر و فن کا جلوہ دکھایا ہے۔ چونکہ مولانا کو تصوّف سے زیادہ مناسبت ہے اس بنا پر اس موضوع پر بھی بہت کچھ اس کتاب میں موجود ہے۔

دراصل یہ کتاب تہذیب نفوس، اصلاحِ نفس اور تزکیۂ قلب کا ذریعہ ہے علماء اور صوفیہ کی زندگی کے واقعات نفس انسانی پر اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ پرانے چراغ پر گہری اسلامی فضا چھائی ہوئی ہے۔ اصلاحی و دینی فضا سے پوری کتاب مملو ہے مگر یہ کوئی وعظ کی کتاب نہیں ہے۔ یہ انسانی زندگی کے حقائق ہیں بلکہ حقائق کے طلسم ہیں جن سے نفوس انسانی متأثر ہوتے ہیں۔ قصّہ کہانی کی کتاب پڑھتے وقت ذہن میں یہ حقیقت بھی ابھرتی رہتی ہے کہ یہ قصّے گڑھے گئے ہیں واقعی نہیں ہیں کبھی پیش نہیں آئے مگر حضرت مولانا نے جن شخصیات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب حق ہے اور سچ ہے پھر راوی اتنا معتبر، لہٰذا ان واقعات کا اثر براہ راست نفس انسانی پر مرتب ہوتا ہے پھر ان واقعات کے وقوع پذیری کے وقت خود مصنّف بطور شاہد عادل موجود رہا ہے۔

پرانے چراغ کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کی ثقافتی اور ذہنی تاریخ ہے۔ اس میں روح عصر منعکس ہے۔ اس میں علماء اور مسلم اہل نظر زعماء کے حالات بڑی تفصیل اور دلکشی سے بیان ہوئے ہیں پرانے چراغ کے آئینہ میں مسلمانوں کی ثقافتی زندگی کا دور جدید میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے، اس میں وہ تمام رجحانات مصوّر و منقش ہیں جن سے مسلمان بیسویں صدی میں گذرے ہیں۔ اس میں ندوہ بھی پورے آب و تاب سے جلوہ گر ہے، دیوبند بھی پوری طرح جلوہ فشاں ہے۔ علی گڑھ اور جامعہ کی بھی دلکش ترجمانی ہے تمام مکاتب فکر کے اہم اشخاص کے خاکے اس کتاب میں آگئے ہیں۔ مولانا نے واقعات کی تاریخ لکھنے کا بھی اہتمام کیا ہے اور تاریخ وفات بھی دیدی ہے۔ اس لیے کہ یہ واقعات اور تذکرے سب مرحومین کے ہیں۔ زندہ اشخاص پر نہ لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ایک مشن کی ترجمان ہے۔ اس میں مصنّف کے سامنے اسلامی اقدار اور

اسلام کا دعوتی مشن بھی ہے۔ چونکہ مولانا کی زندگی کا سب سے روشن پہلو ان کا اسلامی خلوص ہے اسی خلوص کی چاندنی ان کے خاکوں میں پوری طرح پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی شخصیت اور سیرت کے تمام خصائص ان خاکوں سے عیاں ہیں۔ یہ خاکے بے مقصد نہیں ہیں، ایک اعلیٰ مقصد، ایک دعوتی انداز نظر، ایک اسلامی فضا اور تمام کرداروں میں اسی خلوص کی عظمت پیش کی گئی ہے اور اعلیٰ اقدار حیات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان میں علماء عظام بھی ہیں، زعمائے کرام بھی، اور دور جدید کے بڑے بڑے صوفیہ بھی موجود ہیں۔ ہر خاکہ اپنی خصوصیت اور امتیاز کے باعث عظمت کا حامل ہے۔ خاکہ نگاری کا تعلق ذاتی تعلقات کی نوعیت اور گہرائی سے ہے۔ مولانا کے خاکے سب کامیاب ہیں، ان کے اندر جذبات کی ادائی، واقعات کی مؤثر ترجمانی اور حسن بیان نے عجب دلکشی و رعنائی پیدا کر دی ہے۔ اسلامی ذہن اور اصلاحی مشن نے ایک روحانی فضا کو جنم دیا ہے اس لیے ہر خاکہ حسن و نور کا ترجمان ہے جس طرح گلاب کے پھول میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کہاں رنگ ہلکا ہے اور کہاں سے شوخی شروع ہوتی ہے۔ کچھ یہی حال ان خاکوں کا ہے بلکہ پوری کتاب میں ایک ایسی دلکش فضا ہے جس کا بیان زبان قلم سے ممکن نہیں۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھٹکلی

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف

# پُرانے چراغ کا معیار و اعتبار

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے خامۂ معجز بیاں کا جب کبھی خیال آتا ہے۔ تو فوراً ذہن میں مضامینِ نو کے انبار کا تصوّر ابھرتا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ میر انیسؔ نے حسبِ ذیل شعر اسی موقع کے لیے کہا ہے ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مضامینِ نو کے انبار کا تصوّر اس لیے ہے کہ کوئی عنوان اور کوئی موضوع ایسا نہ ہوگا جس پر آپ کے قلم نے گل افشانی نہ کی ہو۔ اور پھر کوئی مضمون بھی ایسا نہ ہوگا جس کا کوئی پہلو صوری و معنوی یا کسی اور اعتبار سے تشنہ رہا ہو جو مضمون بھی زیر بحث ہوتا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا آپ کے قلم کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس میدان کی شہسواری میں آپ کا کوئی حریف میرے خیال میں نہیں۔ یہ آپ کی انفرادی خصوصیت ہے۔ اور آپ کی خصوصی شناخت ہے۔ پھر آپ کی یہ بھی ایک تابناک خصوصیت ہے کہ آپ نے اپنی پوری زندگی پرورشِ لوح و قلم کے لیے وقف کر دی۔ یہی وہ حقائق و بینات ہیں جن کی بنا پر عرصۂ علم و ادب میں آپ کی شہسواری کو بے مثل اور بے بدل تصوّر کرنے میں اپنے آپ کو میں حق بجانب سمجھتا ہوں۔

آمدم برسرِ مطلب۔ مولانا موصوف کی جلیل القدر تصنیف "پرانے چراغ" کے محاسن و محامد کے اعتراف کے طور پر مذکورہ کتاب پر کچھ خیال آرائی کا عزم میں نے کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت ساری سوانح عمریاں آپ بیتیاں خاکے اور سفرنامے پڑھے ہیں، پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تصنیف گنج ہائے گرانمایہ تو علم و ادب اور تواریخ و سیر کا گوہر آبدار ہے۔ رشید صاحب کی ندرت تحریر کا، کون ہے جو والہ و شیدا نہ ہو۔ اسی طرح ماہر القادری مرحوم کی کتاب "یادِ رفتگاں" شخصیات کے تعارف کی ایک سعی مشکور ہے۔ لیکن تحقیق و تدقیق کا جو انداز تبیین و توضیح کا جو سلیقہ "پرانے چراغ" کے اندر دیکھا اس کی بصیرت افروزی اور روح پروری کو معرض تحریر میں لانا میرے لیے حیطۂ بشری سے باہر ہے۔ میری یہ تحریر اندھی عقیدت کی اختراع و گل افشانی نہیں ہے بلکہ اپنے ضمیر کی میزانِ عدل و قسط پر تلے ہوئے حقائق کا برمحل انکشاف ہے۔ اور مسلّمات و بینات کا اعتراف ہے۔ مولانا موصوف کی ندرتِ تحریر اور لطافتِ بیان کے بارے میں بقول غالب میرا یہ عقیدہ ہے ؎

یہ جنّت نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

"پرانے چراغ" کے اوراق کے دامن میں شخصیات کے سوانحی نقوش کے نگار خانے سجے ہوئے ہیں۔ "اس انجمنِ گل میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی"، کے مصداق رنگ و آہنگ کے لاتعداد جلوے زیر بحث کتاب کے دامن میں تبسّم ریز ہیں۔ وجدان اور ذوقِ سلیم یہ صدا دے رہا ہے ؎

اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں

میری علمی بے بضاعتی کتاب ہٰذا کے تمام عناصر کو سمیٹنے سے قاصر ہے۔ تاہم مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر کچھ محاسن و محامد کو نوک قلم پر لانے کی سعی و کاوش سے عہدہ برآ ہونے کی توقع رکھتا ہوں۔

"پرانے چراغ" ایک ایسی مہتم بالشان تصنیف ہے کہ جس کی ہر دل عزیزی اور ہمہ گیری پر خود مصنّف کو بجا طور پر ناز ہے۔ جیسا کہ پرانے چراغ حصّہ دوم (دوسرا ایڈیشن)

کے پیش لفظ میں انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

یہ دیکھ کر مسرّت آمیز حیرت یا حیرت آمیز مسرّت ہوئی کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اور بڑے شوق سے پڑھی گئی ہے۔ علم و ادب کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ نہ تھا۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک مصنّف، شاعر اور اہل قلم اپنی علمی تصنیفات کو اپنا سرمایہ فخر اور حاصل عمر سمجھتا رہا ہے۔ لیکن اس نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا کہ ان بھاری بھرکم تصنیفات کے مقابلے میں جو بڑی عرق ریزی اور دیدہ وری سے لکھی گئیں۔ اس کی دوسری کتاب جو اس کے نزدیک ہلکی اور چلتی ہوئی تھی۔ اور جس کو اس نے کسی ذاتی جذبہ و تقاضہ یا دوستوں کی تفریح طبع کے سامان کے طور پر لکھا تھا زیادہ مقبول ہوئی عربی کے مشہور مصنّف علاّمہ ابن جوزی کا معاملہ بھی یہی ہے کہ ان کی درجنوں مایہ ناز تصنیفات کے مقابلے میں ان کی زندگی کے نقوش و تاثرات اور خیالات و اعترافات کا مجموعہ "صید الخاطر" کہیں زیادہ مقبول ہوئی۔ ہندوستان میں دیکھئے تو غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ لیکن ان کی شہرت و عظمت ان کے اردو کلام سے ہے۔ جس کو وہ زیادہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور اپنے بعض معاصرین کو تنقید اور خوردہ گیری پر ان کو کہنا پڑا تھا۔

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

"پرانے چراغ" کی مؤثر تصنیف کے سلسلے میں مصنّف کے حسب ذیل محسوسات بھی قابل ذکر ہیں۔ جن سے انسانی جذبات کے زیر و بم کی جاں گدازی اور نشاط انگیزی قارئین کے شعور و وجدان پر دستک دیتی ہیں مصنّف نے ایک جگہ اسطرح لکھا ہے۔

"پرانے چراغ" کی تصنیف کا محرک چند محبوب و محترم شخصیتوں کے بارے میں اپنی ذاتی معلومات، روابط و تعلّقات کا اظہار ان کے احسانات

واثرات کا اعتراف اور ان کو تاریخی طور پر محفوظ کر دینے کا جذبہ تھا۔ اس کو نفسیاتی کمزوری کہئے یا خوبی کہ اس بارے میں مصنّف کچھ زیادہ ذکی الحس واقع ہوا ہے اس کو اپنے ماضی، بیتے ہوئے دن، برتے ہوئے اشخاص، بچھڑے ہوئے بزرگوں اور احباب اور گزرے ہوئے واقعات و حالات سے کچھ زیادہ دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ اقبال نے اپنے متعلّق جو کچھ کہا تھا وہ صرف ایک لفظ کی ترمیم سے حسب حال ہے ؎

میں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو

"پُرانے چراغ" کے عمیق مطالعے سے یہ حقیقت منکشف و واشگاف ہوتی ہے کہ فاضل مصنّف نے سماجی اور تہذیبی تاریخ کے خزانوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے زرخیز تخیل اور بے بہا تخلیقی ذکاوت سے تاریخی حقائق کو زندہ اور متحرک پیکروں میں ڈھال دیا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا محمد علی پر لکھے ہوئے سوانحی نقوش ملاحظہ ہوں۔

اللہ نے محمد علی کو وہ سب صلاحیتیں اور کمالات عطا فرمائے تھے جو ایسے رہنماؤں کے لیے ضروری ہیں۔ جو ملکوں اور قوموں میں انقلاب لاتے ہیں۔ اور سوتی بستی جگاتے ہیں۔ اور ممولوں کو شہباز سے لڑا دیتے ہیں۔ خلوص کا ایک دریائے بیکراں، پارے کی سیمابی اور بجلیوں کی بیتابی، خطابت کی جادوگری، شخصیت کی دلآویزی، خلقی و فطری محبوبیت و موہنی اور سب سے بڑھ کر دل کی چوٹ اور جگر کا وہ زخم جو اس درجہ میں (شیخ الہند مولانا محمود حسن کو مستثنیٰ کر کے) ان کے ساتھیوں میں سے کم کسی کے حصّے میں آیا تھا۔ یہی وہ احساس و یقین تھا جس نے ان سے ایسے اشعار کہلوائے جو ان کے حال کی سچّی تصویر تھی ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو

خوش ہوں کہ وہ پیغام فنا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف

کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

پھر ان کی قلندرانہ شان اور مجذوبانہ ادا جس نے حق کہنے میں کبھی بڑے چھوٹے دوست دشمن کی پروا نہیں کی اور جس کے نتیجے میں بعض اوقات میدان میں تنہا رہ گئے۔ لیکن انھوں نے اس تنہائی کی کبھی پروا نہ کی۔ بلکہ اس کو وسیلۂ نجات اور شرط ایمان سمجھا اور ان کی زبان سے وہ الہامی شعر نکلا جو بڑے بڑے عارف و موحد کی زبان سے نکل سکتا ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

مولانا علی میاں کی تحریر کا ایک طرح دار انداز یہ بھی ہے کہ مختصر اور دریا بکوزہ الفاظ میں وسیع اور ہمہ گیر حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کے خامۂ معجز بیاں کی قوت کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ حسب ذیل سطور ملاحظہ فرمائیں۔

"واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کو بہت کم لوگوں نے پہچانا اور اس میں شبہ ہے کہ انھوں نے خود بھی پہچانا یا نہیں۔ اور یہ کوئی عیب نہیں ایک ایسی مختلف الحیثیات اور جامع صفات ہستی کی تعریف ہے جس کا ہر پہلو مرکزی اور بنیادی معلوم ہوتا ہے۔ اور تماشائی محو حیرت بن کر کہتا ہے"

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

زیر نظر کتاب کی اوراق گردانی میں مصروف ہوں۔ اب میرے سامنے مولانا ابوالکلام آزاد پر لکھا ہوا مضمون ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو ہمیشہ میرا محور مطالعہ رہے ہیں۔ اس مقام پر مجھے یہ کہنے دیجئے کہ ان کے رشحاتِ قلم کا تو میں فطری اور پیدائشی شیفتہ و دلدادہ اور گرویدہ ہوں۔ خطبات آزاد تذکرہ مضامین البلاغ مضامین الہلال اور غبار خاطر یہ ساری تصنیفات ہمیشہ میرے زیر مطالعہ رہی ہیں، لطف یہ کہ ہزار بار پڑھ کر بھی میں ان کتابوں کے مطالعے

سے خود کو فارغ اور عہدہ برآ تصور نہیں کرتا۔ ترجمان القرآن جیسی تفسیر مولانا آزاد کے علمی تبحر، قلمی توانائی اور ادبی بلند قامتی کی مظہر ہے۔ پرانے چراغ میں مولانا آزاد پر لکھا ہوا مضمون پڑھتے پڑھتے میں ایک غیر معمولی انبساط و انشراح کے عالم میں ڈوب گیا۔ ایک تو مولانا آزاد کا فرد دس بکف تذکرہ اس پر مولانا علی میاں کا حسن رقم گویا سونے پہ سہاگہ کے مترادف ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں خامۂ معجز نما کی افسوں طرازیاں ملاحظہ ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد جن کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ ان کی تقریر کا ایک حصہ ذہن میں محفوظ رہ گیا۔ انھوں نے انسانی مساوات و اخوت کا اسلامی نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے سنن ابوداؤد کی ایک حدیث کا حوالہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر شب رب سے سرگوشیاں اور دعا و مناجات کرتے ہوئے سنا گیا اس میں ایک فقرہ یہ تھا۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں یہ

اسی مضمون میں حضرت مولانا علی میاں نے ایک جگہ "الہلال" میں شائع شدہ مولانا آزاد کے ان مضامین کا تذکرہ کیا ہے جس میں طرابلس و بلقان کی جنگوں اور انور پاشا کے مجاہدانہ کارناموں اور مسجد نور کے واقعے پر لکھے گئے تأثرات و کیفیات کے بارے میں حضرت علی میاں کا خامہ گوہر بکف اس طرح رقم طراز ہے۔

اس زمانہ میں پڑھا ہوا مضمون آج تک نہیں بھولتا۔ جس میں مولانا طرابلس کی ایک شہادت زار میں انور پاشا کی آمد، شہیدوں کی لاشوں کا معائنہ اور ان کے تأثر کی منظر کشی کی تھی۔ بلبلوں کا یہ مشہد مقدس، انور پاشا جیسے درد مند اور بلند حوصلہ مجاہد کی آمد اور مولانا آزاد کا قلم ان سب نے مل کر اس مضمون میں وہ اثر اور طاقت پیدا کر دی تھی کہ آنسوؤں کے سیل رواں کو تھامنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اور رگ و پے میں چنگاریاں سلگتی نظر آتی تھیں۔

دیکھا آپ نے مولانا آزاد کے تأثرات کی حضرت علی میاں نے کس طرح عکاسی و

غمازی کی ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تاریخ کے دریچے سے ہم اپنی آنکھوں سے وہ منظر خونیں دیکھ رہے ہیں۔ مضمون ہذا میں مندرجہ ذیل جملہ کس قدر افسوں طراز ہے۔

"رگ و پے میں چنگاریاں سلگتی نظر آتی تھیں"

حرارت حیات کی تجدید کو بیان کرنے کے لیے مذکورہ بالا جملہ کس قدر معنی خیزی اور بصیرت افروزی کا حامل ہے۔ اہل نظر ہی اس کی داد دے سکتے ہیں۔ واقعی علی میاں کا قلم تخلیقی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ جس کی ہر لہر انداز نگارش کو شگفتہ، خوش آہنگ اور فکر انگیز بناتی ہے۔ وہ الفاظ و معانی کے نگار خانوں کو تخیلی نزاکت اور مصورانہ چابکدستی سے سنوارتے ہیں۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔ زندگی دراصل شعور کے آغاز سے انجام تک روشنی کا ایک ہالہ ہے۔ ادیب و قلم کار کا یہ کام ہے کہ اس کی نازک، خواب گوں اور پراسرار کیفیتوں کو سچائی کے ساتھ پیش کرے۔ سچا ادیب و فنکار الفاظ کی ایمائی قوت سے رنگ و آہنگ کی تخلیق کرتا ہے۔ جلال و کمال کے نگار خانوں کو سجاتا ہے۔ لفظیات کے تار و پود سے ماورا فلسفیانہ حقائق کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ لیکن اس عمل میں اظہار کی سطح پر ایک ایسی تازگی اور نغمگی اور شگفتگی قائم رہتی ہے۔ جس کی حیات آفرینی اور جمال پروری میں کلام نہیں۔

"پرانے چراغ" کے دامن میں نامور اور باکمال شخصیات کا گویا ایک جم غفیر ہے۔ اس چمن زار کا کوئی پھول ایسا نہیں جو اپنے رنگ و بو کے اعتبار سے خود ایک چمن زار نہ ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ پرانے چراغ کی تصنیف درخشندہ ستاروں سے مزین ایک مطلع نورانی ہے ان ضیا پاش ستاروں میں کیسے کیسے مؤقر اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔ ہر ایک نام پر جان چھڑکنے کو جی چاہتا ہے۔ شخصیات کی اس طویل فہرست میں بعضوں سے تو مجھے دیوانگی کی حد تک عشق ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ذکر خیر سے روح کو کیوں وجد نہ ہو۔ جبکہ

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ فردوس گوش ہے تو مولانا عبدالماجد دریابادی کی سرگذشت

معدن رنگ و آہنگ ہے اس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین (صدر ہند) مولانا محمد علی جوہر اور غلام رسول مہر کے ذکر خیر سے ناچیز اسی جنّت کی رعنائیوں اور رنگینیوں میں کھو گیا۔ جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

"پرانے چراغ" کی معرکۃ الآرا تصنیف کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں مشاہیر ادبا و فضلاء کے مکتوبات کے گراں قدر اقتباسات کے مطالعے کی سعادت اور خوشہ چینی کے مواقع دستیاب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر رشید احمد صدّیقی کے مکتوب کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

محترمی سلام مسنون

آپ کا گراں قدر عطیہ تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی موصول ہوا عزّت افزائی کا شکر گزار ہوں۔ اس عطیہ کی یوں اور خوشی ہوئی کہ والد مرحوم بھی حضرت سے بیعت تھے۔ اور اس احتیاط و احترام سے نام لیا کرتے تھے کہ گویا بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ جس سے عہدہ برآ ہونا ان کے لئے آسان نہ تھا۔ کتاب بڑی اچھی اور ستھری شائع ہوئی ہے۔ اتنی اچھی اور ستھری جیسے اس پر حضرت کا سایہ پڑ رہا ہو۔ کتاب کے آخر میں جن بزرگوں کے مضامین شامل کر دیے گئے ہیں۔ وہ خاص طور پر بہت اچھے ہیں۔ ان سے حضرت کی شخصیت جیسی دلآویز معلوم ہونے لگی ہے پوری کتاب سے نہیں ہوتی۔ شاید اس لیے کہ ایک میں واقعات مذکور ہیں۔ دوسرے میں شخصیتیں (تاثرات) جگمگاتی ہیں۔ ایک بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ حضرت منطق سے کیوں اس درجہ بیزار تھے۔ اور بار بار قاضی مبارک کے انجام کا حوالہ دیتے تھے۔ تحصیل حدیث کے شرف و سعادت سے انکار نہیں۔ لیکن منطق فلسفہ ریاضی علوم عظیمہ میں

سے ہیں ان کے بغیر تو علوم کی شیرازہ بندی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بغیر خود معلّم بے دست و پا ہے۔

یہاں منطق والی بات پر مولانا علی میاں نے یوں اظہار خیال کیا ہے کہ رشید صاحب کو شاید مدارس عربیہ سے دور رہنے کی وجہ سے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ زمانہ یونانی معقولات (منطق وفلسفہ) میں غلو، شدید انہماک اور اس کو معیارِ فضیلت بلکہ آدمیت سمجھنے اور منقولات (علوم شرعیہ) سے کسی قدر غفلت کا تھا۔ اسی کا ردعمل اور اصلاح تھی جو مولانا کے ملفوظات میں پائی جاتی ہے۔

اسی طرح "پرانے چراغ" کے اوراق پر بے شمار مشاہیر کے مکتوبات ثبت و مرتسم ہیں جن کی معنی خیزی اور علوم پروری لائق صد تحسین و آفرین ہے۔ اس وقت میرے سامنے اور ایک موعظت بردوش مکتوب ہے۔ مولانا سیّد ابوالاعلےٰ مودودی کے اس مکتوب میں ایسا معلوم ہوتا ہے یا قوت و مرجان جڑے ہوئے ہیں۔ آپ بھی اس خط سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد میری باتوں کے قائل ہو جائیں گے۔ خط کا ایک اقتباس یہاں مذکور ہے:

> کچھ مدّت ہوئی آپ کا ایک عنایت نامہ آیا تھا۔ جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ میں وہ کتابیں جن کا ممنون ہوں یا "میری محسن کتابیں" کے عنوان پر کچھ لکھوں۔ میں اس کا جواب دینا بھول گیا۔ ابھی آپ کو خط لکھتے ہوئے اس کا خیال آیا۔
>
> جاہلیت کے زمانے میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ قدیم و جدید فلسفہ، سائنس، تاریخ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں۔ مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا، سب ہیچ تھا۔ علم کی جڑ اب ہاتھ آئی۔ کانٹ، ہیگل، نٹشے مارکس اور دنیا کے دوسرے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بیچاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں

الجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے۔ ان کو اس کتاب کے ایک دو فقروں نے حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے۔ میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے۔ اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے۔ حیوان سے انسان بنا دیا ہے۔ تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی۔ ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح مجھے برملا دکھائی دیتی ہے گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ انگریزی میں اس کنجی کو شاہ کلید کہتے ہیں۔ جس سے ہر قفل کھل جائے۔ سو میرے لیے یہ قرآن شاہ کلید ہے۔ مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے۔ جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

"پرانے چراغ" کے زرّیں صفحات میں چودھری غلام رسول مہر کی سرگذشت میرے لیے جنّت نگاہ اور فردوسِ گوش ہے۔ کیونکہ ان کی متعدد تصنیفات و تالیفات کے بحر معانی کی غواصی کا شرف و امتیاز ناچیز کو حاصل ہے۔ خامہ افسوں طراز کی سحر کاری نے مہر صاحب کا جنوں کی حد تک مجھے گرویدہ و پرستار بنا دیا ہے۔ ایک راست باز قلم کار ایک دیانت دار مؤرخ ایک بالغ نظر محقق ایک جفاکش، مصنّف اور ایک نہایت مہذب انسان کی حیثیت سے میں ان کو تسلیم کرتا ہوں۔

غلام رسول مہر کی سرگذشت میں بعض جگہ مولانا علی میاں نے مہر صاحب ہی کی تحریر کے ذریعے ان کے احوال و کوائف پر روشنی ڈالنے کی سعی مشکور کی ہے۔ سچ پوچھئے تو تاریخ نگاری اور سیرت سازی کا یہ ایک طرح دار انداز ہے۔ مشہور شاعر جناب ماہر القادری مرحوم کے الفاظ میں مجھے یہ کہنے دیجئے کہ ان کی تحریر پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص کارفرما ہے۔

مہر صاحب کے الفاظ میں اب مہر صاحب کے نقوشِ سیرت ملاحظہ ہوں۔ مہر صاحب نے اپنے ذوق وانہماک کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"میں نے زندگی کے بہترین اوقات بے تأمل صرف کئے۔ نہ ہمت نے ساتھ چھوڑا نہ صبر کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار ہوئی۔ نہ طلب وجستجو کی آنچ مدھم ہونے پائی۔ نہ محنت وکاوش کے حوصلوں پر افسردگی چھائی۔ ہزاروں صفحات کی ایک ایک سطر کے پیچ وخم میں میری نظر بار بار دوڑی۔ مختلف عقدوں کی کشائش میں میرے دماغ کی صلاحیت غور وفکر برسوں جولانیوں میں سرگرم رہی ہے۔"

آگے چل کر انکسار واعتراف قصور سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں اپنے علم وعمل کی بے بضاعتی کے پیش نظر اس اہم کام کی تکمیل کا اہل نہ تھا جو کچھ ہوا یہ محض خدائے لایزال کا فضل تھا۔ ایک قرن کے لیل ونہار ان پاک نفوس ہستیوں کے ذکر وفکر میں گزار چکا ہوں جن کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، جاگنا سونا، جینا مرنا، صرف خدا کی رضا سے وابستہ رہا۔ شاید مجھ آلودہ داماں اور سراپا جرم وعصیاں کے لیے یہی مشغولیت وسیلۂ مغفرت بن جائے۔

مہر صاحب کے بارے میں مولانا علی میاں نے بالکل بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ:

"مہر صاحب اپنے طرز نگارش، فارسی کے اعلیٰ ذوق اور انشا پردازی میں مولانا آزاد کے دورِ آخر میں کامیاب متبعین میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ لیکن وہ اپنے تحقیقی ذوق، مورخانہ احتیاط اور مدلل طریقے پر بات کہنے میں کچھ فائق ہیں۔ یہ غالباً مشاغل زندگی کی نوعیت کے فرق کا اثر ہے۔ تاریخ وتصنیف کی بادیہ پیمائی سیاست کے ہفت خواں طے کرنے سے بہت مختلف ہے۔ اول الذکر کے لیے فراغ خاطر، حالات کا اعتدال اور علمی ماحول ضروری ہے۔ اور سیاست کے بیڑے کو طوفانوں اور آندھیوں سے مفر نہیں۔ مہر صاحب فارسی کے برمحل اشعار کا جتنا صحیح استعمال کرتے ہیں اور جیسے انھوں نے اساتذہ ایران کے کلام سے

انتخاب کیے ہیں ان کو انگشتری کے نگینے کی طرح اس کتاب میں جڑ دیا ہے۔ مہر صاحب غالب و اقبال کے بڑے رمز شناس اور ان کے حالات، تاریخ اور کلام کے مطالب اور تلمیحات کی شرح و تحقیق میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔"

مولانا علی میاں کے قلم کا انداز نگارش تحسین کے قابل کیوں نہ ہو جب کہ وہ لفظوں میں واقعات کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعینہٖ ہم اس واقعہ کو دیکھ رہے ہیں۔ مولوی مسعود علی ندوی کی سوانح حیات میں ایک جگہ بڑا دلچسپ واقعہ بیان ہوا ہے۔

مولانا کبھی دار المصنفین کی کسی بھی ضرورت سے دہلی جاتے تو پنڈت جی سے ضرور ملتے۔ وہ اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم تھے۔ اور نہایت مصروف، لیکن ان کو وقت دیتے اور کھانے پر بلاتے۔ اس کے کئی لطیفے مولانا نے ہم لوگوں کو سنائے۔ کہنے لگے ایک مرتبہ زینہ پر ہم دونوں چڑھ رہے تھے۔ پنڈت جی ایک ایک زینہ چھوڑ چھوڑ کر دوسرے زینے پر قدم رکھتے۔ مولانا سے بھی کہا کہ مولوی مسعود تم کیوں میری طرح نہیں چڑھتے۔ کہنے لگے پنڈت جی اگر میں ہندوستان کا وزیر اعظم ہوتا تو اسی طرح ایک ایک زینہ چھوڑ کر چڑھتا۔ گویا یہ اس منصب کی طاقت اور مسرت کی کارفرمائی ہے کہ آپ اس بڑھاپے میں جوان ہیں۔ کہنے لگے ایک مرتبہ کھانے پر انھوں نے کہا کہ وہ سردہ لاؤ جو غلام محمد صاحب (گورنر جنرل پاکستان) نے بھیجا ہے۔ مولانا نے کہا کہ پنڈت جی آپ کو گورنر جنرل پاکستان وہاں سے سردہ بھیجیں اور کوئی کچھ نہ بولے۔ ہمارے پاس پاکستان سے کوئی خط آجائے تو ایک ہنگامہ ہو اور ہفتوں تحقیقات سے چھٹی نہ ملے۔

کتاب ہذا کے مطالعے کے دوران مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کی سوانح حیات زیر فکر و نظر تھی۔ اسی اثناء میں ایک بصیرت افروز نکتے پر نظر پڑی۔ مولانا علی میاں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

میں بھی ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا کہ طالب علمی سے فراغت کے بعد

ایک زمانہ میں جب تصوّف کی بعض کتابوں کے مطالعے سے مجھ پر زبان وادب کی بے حقیقی کا غلبہ ہوا۔ اور طبیعت ادب وانشاء سے اچاٹ بلکہ بیزار ہونے لگی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی ساری دلچسپیوں اور توجہات کو مقاصد اور دینی علوم کے دائرے میں محدود کردوں گا۔ اسی زمانہ میں اپنے وطن رائے بریلی جاتے ہوئے لکھنؤ سے پھر اواں تک (جو مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کا وطن ہے) میرا ان کا ساتھ ہوگیا۔ میرے اس رجحان سے وہ واقف تھے۔ سارے راستے وہ مجھے اس سے باز رکھنے اور دینی مقاصد اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے زبان وادب کی اہمیت کی ضرورت کو میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے اس منفی رجحانات کے نقصانات سے (جو غلو اور مبالغہ سے خالی نہ تھا) مجھے ہوشیار کیا۔ اور تاکید کی میں خدا کی بخشی ہوئی اس صلاحیت کو ضائع اور اس کی ناقدری نہ کروں۔ جس سے میں دین کی خدمت میں بڑا کام لے سکتا ہوں۔ ان کی اس تلقین سے میرے اس خیال میں تزلزل پیدا ہوگیا اور میں اس غلطی سے بچ گیا۔"

اس مقام پر ہوش کے ناخن لینے کا ایک اچھا سروسامان ہاتھ آگیا۔ مولانا موصوف پر گزرے ہوئے اس واقعہ سے غلط قسم کے تصوّف پر ایسی کاری ضرب پڑی کہ توہمات کی دھجیاں اڑگئیں۔ اور معلوم ہوگیا کہ مجاہدانہ اسپرٹ سے عاری کا تصوف کس قدر گمراہ کن اور حرارت زندگی سے بیگانہ ہوتا ہے۔ تصوّف یہ نہیں کہ آدمی اپاہج بن کر میدان زندگی سے فرار کی راہ اختیار کرے۔ بلکہ حقیقی تصوّف یہ ہے کہ آدمی زندگی کی دوڑ دھوپ میں مشغول رہ کر انابت وتفویض الی اللہ کی روح کو برقرار رکھے۔ مولانا علی میاں نے اپنے اس واقعے کو کتاب ہذا میں بیان کرکے عابدِ عزلت گزیں کو کارزارِ حیات میں اترنے کی دعوت دی ہے۔ اور اصلی تصوف کی نشاندہی کی ہے۔ اس مقام پر علامہ اقبال کا حسب ذیل شعر انگشتری پر نگینے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

کمالِ ترک نہیں آب وگل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

اسی طرح ترک دنیا کا حقیقی مفہوم مولانا رومی کے مندرجہ ذیل شعر سے مترشح ہوتا ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بودن
نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

اس سلسلے میں اکبر الہ آبادی نے بڑا موعظت بردوش پیغام دیا ہے ؎

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں گھومو
جائز ہے غباروں پہ اُڑو چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ اکبر کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

کتاب ہذا کے اوراق میں مولانا علی میاں کے قلم سے لکھا ہوا، جگر مرادآبادی کا تذکرہ مولانا موصوف کی ادب پروری، شعر فہمی اور قدر شناسی کا ایک واضح نشان ہے۔ اور یہ امر ان کے ذوق جمال کا غماز و آئینہ دار ہے۔ ذوق جمال تو ایک فطری ودیعت ہے۔ جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں۔ لیکن مولانا موصوف کی نگارشات ہی نہیں بلکہ افکار و کردار اور گفتار و رفتار ہر چیز میں آپ کا ذوقِ جمال مسکراتا ہے۔ جگر مرادآبادی کے لکھے ہوئے مضمون میں آپ کے ذوقِ جمال نے جو گلکاریاں کی ہیں۔ وہ آپ کی شخصیت کا ایک تابناک پہلو ہے۔ اس کے برخلاف بعض کٹھ مُلّا سرے ہی سے ذوق جمال سے عاری ہوتے ہیں۔ حالانکہ اسلام سرتاسر جمال ہے۔ اللہ جمیل ویحب الجمال ایک کھلی حقیقت ہے۔

یہاں مجھے ایک چیز عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ میرے حلقۂ احباب میں ایک مولوی صاحب ہیں جو مجھ سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ انھیں شعر و ادب سے سخت نفرت اور وحشت ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ ایک طبعی مرض ہے جس کو وہ بطور فخر بیان کرتے ہیں، ذوقِ جمال کا فقدان بھی تو ایک مرض ہے۔ میں نے ان کی شان میں قصیدے کے طور پر ایک شعر لکھا ہے۔ اور وہ یہ ہے ؎

فقیہہ کا تو نرالا مزاج ہوتا ہے  کہ بوئے خوش سے انھیں اختلاج ہوتا ہے

اس کے برخلاف "پرانے چراغ" کا ہر ورق ذوقِ جمال کا مہکتا ہوا ایک چمن زار ہے جگر صاحب کے تذکرے میں مولانا علی میاں کی شعر فہمی اور نکتہ آفرینی کا جواب نہیں۔ جگر صاحب کے جو اشعار مولانا موصوف نے کتاب ہٰذا میں قلمبند کئے ہیں۔ ان سے گلشنِ جمال سے آپ کی خوشہ چینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ان اشعار کے سلسلے میں جن گراں قدر خیالات و محسوسات کا آپ نے اظہار کیا ہے۔ ان کے اندر شعری جمال مسکراہٹ اہل نظر کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ آپکے خامہ معجز نما نے اس طرح گل افشانی کی ہے۔

"میں نے اقبال کے سلسلے میں یہ بات پہلے بھی لکھی ہے کہ کسی شاعر یا کسی کلام کی پسندیدگی کا راز یہ ہے کہ اس میں (قاری کو) اپنے خیالات کی ترجمانی اور اپنی ذات کا عکس نظر آتا ہے۔ انسان درحقیقت اپنے اوپر عاشق ہوتا ہے اور جہاں جہاں اپنی پرچھائیاں دیکھتا ہے اس کے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرتا ہے۔ جگر صاحب کو پسند کرنے کا بالعموم (اور ان غزلوں کو خصوصیت کے ساتھ پسند کرنے کا) راز یہ تھا کہ اس میں اپنے بہت سے ان خیالات کی ترجمانی ملتی تھی جن کو ادا کرنے کے لیے نہ زبان تھی، نہ موزونیت نہ لیاقت، یہ غزلیں سنیں تو معلوم ہوا کہ دل یہی کہنا چاہتا تھا۔ لیکن گونگا تھا۔ یا جوہر شاعری سے محروم، شاعر نے ان خیالات کو اس خوبی سے ادا کر دیا۔ جہاں اپنا طائرِ خیال بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

اس سلسلے میں تذکرہ جگر میں مولانا موصوف کے قلم سے نکلی ہوئی ایک اور تحریر ملاحظہ ہو۔

"اب وہ غزل سنتے چلئے جو فرمائش پر جگر صاحب نے بار بار سنائی اس وقت بھی ان کا نغمہ و آہنگ جو انہی نے شروع کیا تھا اور انھیں کے ساتھ چلا اور جو ان کے کلام کی گہرائی اور روح کی بے چینی کے ساتھ بہت ہم آہنگ تھا۔ کانوں میں گونج رہا ہے۔ اس غزل میں ان کے اخلاق کی سچی تصویر اور ان کی طبیعت کی خودداری اور ارجمندی بھی شراب کی طرح کھینچ کر آگئی ہے۔

جب تک کہ غمِ انسان سے جگر انسان کا دل معمور نہیں
جنّت ہی سہی دنیا لیکن جنّت سے جہنّم دور نہیں
جز ذوقِ طلب جز شوقِ سفر کچھ اور ہمیں منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں
ہیں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی وہ وار کہ جو بھرپور نہیں
اس نفع و ضرر کی دنیا سے میں نے یہ لیا ہے درسِ جنوں
خود اپنا زیاں تسلیم مگر اوروں کا زیاں منظور نہیں

کتاب ہذا میں متعدد مقامات پر بعض قرآنی آیات کی تفسیر و تاویل کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں جن کی دلکشی و بصیرت افروزی میں کلام نہیں۔ اس مقام پر ہم مولانا موصوف کو علوم تفاسیر کے بحرِ بے پایاں کی شناوری میں کمال و جمال سے متصف پاتے ہیں۔ نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کا عجیب انداز ہے۔ جو مولانا موصوف کے خامہ معجز نما کا امتیازی وصف ہے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر اس کے دو نمونے یہاں صفحۂ قرطاس پر ثبت کئے جاتے ہیں جن سے مولانا کی تفسیری اہلیت و ذکاوت کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

"میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہید کے لیے جس "حیات" کی خوشخبری دی ہے، اس میں یہ چیزیں بھی شامل ہیں، قرآن کی آیت "بل احیاء عند ربھم" میں لفظ "احیاء" کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے، جتنا عام مفسرین نے سمجھا اور لکھا ہے، میرے خیال میں شہید کے چھوڑے ہوئے آثار کی بقا اور ان کی شہرت و اشاعت، اس کے نام اور کارناموں سے لوگوں کا شغف اس تذکرے اور حالات میں لوگوں کی دلچسپی معاصرین کا اعتراف اور آئندہ آنے والوں میں ذکر خیر بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے، یہ لوگ موت کو گلے لگاتے ہیں اور اللہ زندگی ان کے لیے مقدر کر دیتا ہے، مخالفین و اعداء ان کا نام و نشان مٹانا چاہتے

ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی عزت و شہرت میں اضافہ کا فیصلہ کرتا ہے، اور فیصلہ اللہ ہی کا نافذ ہوتا ہے" وہ علیم بھی ہے، قدیر بھی۔

---

کہتے ہیں کہ جس کا رزق جہاں مقدر ہوتا ہے وہیں ملتا ہے، اس کے لیے وطن، پردیس اور یگانہ و بیگانہ کی قید نہیں، میرے نزدیک یہ کلیہ مادی و غذائی اور معنوی و روحانی دونوں قسم کے رزق کے لیے عام ہے، اور قرآن مجید میں معنوی حقیقتوں کے لیے رزق کا استعمال آیا ہے "اتجعلون رزقکم انکم تکذبون" مصنفین مفکرین اور اچھے مقصد کے لیے کوشش کرنے والوں کو جن پر وہ مقصد طاری ہو جائے رہنمائی کے حصول، نئے نئے انکشافات، خلاف قیاس معلومات و مواد کی فراہمی اور غیبی امداد کے ایسے ایسے تجربے ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے آیت قرآنی" ویرزقہ من حیث لا یحتسب" کی تفسیر کے نئے نئے نمونے اور مثالیں سامنے آتی ہیں، اور ان کے نزدیک اس آیت کا وہی محدود مفہوم باقی نہیں رہتا، جو تفسیر و ترجمہ کی عام کتابوں میں لکھا گیا ہے اور عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

(مولانا) عبدالرحمٰن ملّی ندوی
ایڈیٹر مجلہ "النور"، جامعہ اکل کوا

# حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "پرانے چراغ"

## تاریخ نگاری وتذکرہ نویسی کی میزان میں

فن تاریخ نویسی اپنے ہمہ گیر موضوعات کے اعتبار سے نازک ترین اور آفاقی سمجھا جاتا ہے، جس میں امتحان اس قلم کا ہوتا ہے جو دیدہ ور اور تجربہ کار مؤرخ کے ہاتھ میں بڑی نزاکت و احتیاطی کے ساتھ چلتا ہے۔

بیتے ہوئے لمحات وواقعات اگر مبالغہ کے ساتھ بیان کیے جائیں تو یہ داستان ہے رنگ آمیزی سے کام لیا جائے تو یہ اساطیر ہے اور صحت واستناد کو پیش نظر رکھا جائے اور حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ تاریخ ہے جس کی طرف قرآن نے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔

"أفلم یسیروا فی الأرض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلهم"، اور بعض جگہ "سیروا فی الأرض"، فرمایا۔

تاریخ نویسی ایک نازک وناتواں آبگینہ ہے جو خلاف واقعہ، شاعری اور مبالغہ آرائی کا قطعاً متحمل نہیں، بلکہ اگر کسی مصلحت کے پیش نظر حقیقت کو اس کے اصل چہرہ سے ہٹا کر پیش کیا جائے تو تاریخ نگاری کی شریعت میں ناقابل معافی جرم اور بڑی علمی خیانت ہے۔

تاریخ مصوّر کا وہ کیمرہ ہے جو باریک سے باریک چیز کو اپنی گرفت میں لے کر اسے نتائج کے جوہری ساخت میں پیش کرتا ہے۔

انسانی معاشرے کو سنوارنے یا شخصیات سازی یا کشی میں جو قوتیں کارفرما رہی ہیں وہ تاریخ ہی سے وابستہ ہیں۔ تاریخ قوموں کے عروج وزوال کی داستان پیش کرتی ہے، تاریخ رجال الفکر والدعوۃ مصلحین ومربین کے حالات بھی بلا کم وکاست پیش کرتی ہے۔ ان کے محاسن ومعائب کی سچی تصویر کشی بھی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اعاظم رجال اور بڑے بڑے مفکرین نے تاریخ نویسی کی اہمیت وافادیت کا اعتراف کیا ہے۔ اس لیے تاریخ کو "فصل" کا نہیں بلکہ "وصل" کا ذریعہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ کے ذریعہ آپ دلوں کو جوڑ بھی سکتے ہیں اور کذب بیانی کے واسطہ سے دلوں میں دراڑ بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ تخریب کاری کی مسموم آندھیوں کی شکار بھی ہو سکتی ہے اور تعمیر وارتقاء کے جاں فزاں ہواؤں سے لطف اندوز بھی، ہر دور کے علمی طبقہ نے اپنے اپنے مذاق ومزاج کے اعتبار سے تذکرہ نگاری وتاریخ نویسی کے میدان میں قدم رکھا اور اس فن میں مہارت بھی پیدا کی، دیکھئے "خطیب کی تاریخ بغداد، ابونعیم کی تاریخ اصفہان سہمی کی تاریخ جرجان، اعاظم رجال کے تذکرہ کے لیے دیکھئے، ابن عماد کی شذرات الذہب، ذہبی کی العبر فی خبر من غبر، وغیرہ۔ ہندوستان میں اس طرف توجہ سب سے پہلے شاہ عبدالحق محدّث دہلوی نے "اخبار الاخیار" اور بھروچی نے "النور السافر" لکھ کر کی ہے۔ اس کے بعد علاّمہ غلام علی آزاد بلگرامی نے اس موضوع پر دو کتابیں لکھی، عربی میں سبحۃ المرجان، اور فارسی میں مآثر الکرام "تذکرہ اکابرین اسی طرح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد ماجد مولانا عبدالحیؒ نے نزہۃ الخواطر" کی ضخیم جلدیں لکھ کر تاریخ نویسی کی دنیا پر ایک عظیم احسان کیا ہے اسی طرح قاضی اطہر مبارک پوری کی کتاب "رجال السند والہند" بھی قابل ذکر ہے۔ اور خود حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی مدظلہ کی "رجال الفکر والدعوۃ، اور ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" بھی مورخین ومفکرین کی نگاہ سے گذرتی رہی ہیں اور گذرنا چاہیئے، اس لیے کہ کوئی بھی محرر اور صاحب طرز ادیب اپنی تاریخ نویسی وتذکرہ نگاری کو ایسے سجے سجائے اور

البیلے طرز پر کرنے کہ وہ اپنے نثری اسلوب کی بنا پر خود مقصود بن جائے، اور اس میں اسلامیت بھی کامل طور پر جھلکے تو یہ ادبی فن پارہ و شاہکار کا اعلیٰ نمونہ ہوگا۔

ایسے ہی ادبی فن پاروں اور علمی و ادبی و تاریخی شاہکاروں میں حضرت العلامہ مفکر اسلام نباض زمانہ حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شہرۂ آفاق کتاب "پرانے چراغ" بھی ہے۔ جو اپنے نام ہی سے ظاہر کر رہی ہے کہ مصنف نے اپنے معاصرین، مصلحین، اساتذہ مشائخ امت، اور اعیان البلد کا ایسا دلآویز تذکرہ کیا ہے کہ تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ ادب اسلامی کا مستقل باب بن گئی ہے جس میں علماء ربانیین اور دعاۃ مخلصین کا دلآویز تذکرہ ہے، کسی کے علم و فضل کی تاریخ، کسی کا دلآویز تعارف، کسی کی زندگی پر حقیقت پسندانہ و عالمانہ تبصرہ، کسی کے علمی نوادرات کا ذکر اور کسی کے سیاسی افکار و خیالات، اور کسی اسلامی ذہن رکھنے والے سیاسی رہنما کی دور بینی کا ذکر خیر آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔ گویا کہ کتاب کیا ہے بلکہ تاریخی حقائق کا دائرۃ المعارف اور انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی دیانت دار مؤرخ کا اپنے کلام پر تبصرہ کرنا جہاں ایک نازک اور دور بیں کام ہے وہیں دوسروں کے حالات زندگی کا تاریخی حیثیت سے جائزہ لے کر حوالۂ قرطاس کرنا عظیم ترین ذمہ داری بھی ہے۔ کیونکہ ذرا سی ذہنی لغزش اور قلم کی معمولی جنبش سے مؤرخ مبالغہ آرائی اور غلو پسندی کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ پھر مزید اس میں ادب کی چاشنی اور الفاظ کی جودت و مٹھاس تلاش کی جائے یقیناً یہ اولوالالباب، اولوالعزم، اور اولوالنہی کا ہی کام ہو سکتا ہے اس لیے کہ مؤرخ زبان کا ادا شناس، اپنے زمانہ اور اہل زمانہ کا مزاج شناس و کہنہ مشق اور صاحب اسلوب و طرز ادیب بھی ہوتا ہے۔ آیئے! ہم پرانے چراغ" کی اس تحریر کو پڑھتے چلیں اور صاحب کتاب کے قلم کو تحسینی کلمات سے آفریں کہیں، جو حضرت نے اپنے استاذ اور دارالعلوم دیوبند کی تاریخی شخصیت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں قلم بند کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"مولانا خاندانی یا ذاتی حیثیت سے کوئی رئیس و متمول شخص نہ تھے مگر اللہ

نے ان کو بادشاہوں کا سا حوصلہ اور ظرف (خدا مجھے معاف کرے) میں نے غلط کہا بلکہ اہل اللہ اور نائبین انبیا کا سا حوصلہ اور ظرف عطا فرمایا تھا، "الید العلیا خیر من الید السفلی" پر ساری زندگی عمل رہا وہ بہت کم دوسروں کے ممنون ہوئے اور انھوں نے ایک عالم کو ممنون کیا، ان کا مہمان خانہ ہندوستان کے وسیع ترین مہمان خانوں اور انکا دسترخوان ہندوستان کے وسیع ترین دسترخوانوں میں تھا، حقیقت یہ کہ ان کا دل اس سے بھی زیادہ وسیع تھا"

(پرانے چراغ ج ۱ ص ۱۱۲)

مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

"بعض واقفین کا اندازہ ہے کہ پچاس مہمانوں کا روزانہ اوسط تھا ضیافت و مہمان نوازی، اور اطعام طعام ان کی روحانی غذا اور طبیعت ثانیہ بن گئی تھی ان کی تواضع اور انکساری مہمانوں کے اعزاز و احترام کو دیکھ کر قدیم عرب شاعر کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا ہے۔

وانی لعبد الضیف ما دام نازلاً

وما شیمۃ لی غیرھا تشبہ العبدا

(میں مہمانوں کا غلام ہوں، جب تک وہ میرے گھر مہمان رہے۔ اور زندگی کا یہی موقع ہے جس میں غلام معلوم ہوتا ہوں) ایضاً ص ۱۱۳

سطور بالا سے اندازہ لگائیے کہ حضرات صحابہ اور اہل بیت کرام کی سخاوت و شہامت و حوصلہ مندی کے جو واقعات ہم پڑھتے پڑھاتے ہیں ان کا پرتو مولانا مدنی کی زندگی اور ان کے اخلاق میں پایا گیا یا نہیں، نفس کشی، اپنے نفس کا استحضار اور نفس امارہ کی گرفت سے محفوظ رہنا مولانا مدنیؒ کا حال تھا نہ کہ قال۔

"مولانا علیہ الرحمۃ کی تواضع اس حد تک پہنچی تھی کہ اپنے آپ کو "ننگ اسلاف" سمجھتے تھے حالانکہ اللہ نے ان کو ہر طرح سے اپنے اسلاف کرام کا جانشین اور

نعم الخلف لنعم السلف کا مصداق بنایا تھا۔" (ایضاً ص ۱۱۳)

اندازہ لگائیے ان جملوں کی تاریخی حقیقت کا اور ایک ایک لفظ پر انگلی رکھیے اور جملوں کی ادبیت کا لطف لیجیے، یقیناً آپ گواہی دیں گے ادب اسلامی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

اسی طرح حضرت مولانا مدظلہٗ کی دوسری تحریر کو پڑھیے جس میں حضرت نے اپنی بہن امۃ اللہ تسنیم کا تذکرہ کس خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"پورے نصف صدی پچاس سال کی بہن بھائی کی محبت، یکجائی، رنج و خوشی میں شرکت، مطالعہ و کتب بینی میں رفاقت، تحریر و تصنیف میں صلاح و مشورے پھر حج کی طویل معیت اور آخر میں علالت اور دنیا سے رحلت کی طویل و پُراثر کہانی۔" ("پرانے چراغ" ص ۳۴۰ ج ۲)

مزید تحریر فرماتے ہیں:

"پچاس سال کی مدت بھی اس خیال سے کہی کہ یہ عقل و شعور کا زمانہ ہے ورنہ بچپن کے ابتدائی سال بھی اگر اس میں شامل کر لیے جائیں تو یہ مدت اور بھی طویل ہو جاتی ہے مجھ میں اور مرحومہ میں چھ سال کی چھوٹائی اور بڑائی تھی۔" (ایضاً ص ۳۴۰ ج ۲)

حضرت کی اس تحریر پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ کیسے مترادفات اور اضداد کا کس خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے "تحریر و تصنیف"، "رنج و خوشی"، "مطالعہ و کتب بینی"، جیسے الفاظ پر غور کیجیے کہ اپنے اندر ادبیت کی کتنی مٹھاس اور چاشنی لیے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی اپنی عمر اور بہن صاحبہ کی عمر کے تفاوت کو کتنے پیارے جملہ سے ادا کیا ہے کہ مجھ میں اور مرحومہ میں چھ سال کی چھوٹائی بڑائی تھی، یقیناً ہمیں اس بات کا حق ہے کہ ہم حضرت مولانا مدظلہٗ کی اس تصنیف کو ادب اسلامی کا فن پارہ و شاہکار قرار دیں اور اس کے علمی و ادبی جواہر پاروں سے اپنے عقل و ذہن کو روحانی غذا پہنچائیں، بس میں انہی جملوں پر اپنے قلم کی زبان کو خاموش کرتا ہوں، ورنہ یہ بحر بیکراں ہے مجھ میں کہاں یارا کہ اس کا احاطہ کروں اگرچہ میں لاکھ جتن کر جاؤں۔ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے ــــــــ